داؤد اشرف

# اور کچھ بیاں اپنا

تنقیدی مضامین

قیمت: دس روپے

# اور کچھ بیاں اپنا

تنقیدی مضامین

داؤد اشرف

○ سرورق: غوث محمد
○ کتابت: محمد غالب
○ ابتدائی صفحات: سلام خوشنویس

○ طباعت سرورق: اسٹینڈرڈ ایکویپمنٹ، شانتی نگر، حیدرآباد ۲۸
○ طباعت لیتھو: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان۔ حیدرآباد ۲

○ تعداد: سات سو (۷۰۰)
○ اشاعت: ۱۹۸۰ء
○ قیمت: دس روپے
○ قیمت: پچیس روپے ۲۵ طبع ثانی
○ مالی اعانت: اردو اکیڈیمی، آندھرا پردیش۔ حیدرآباد
○ ناشر: شگوفہ پبلیکیشنز
۳۱۔ حجرہ گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۱



ملنے کے پتے:
○ اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش، اے۔سی گارڈز۔ حیدرآباد
○ الیاس ٹریڈرز، شاہ علی بنڈہ، حیدرآباد ۲
○ مکتبہ جامعہ۔ محمد علی روڈ۔ بمبئی ۳

# فہرست

## ریڈیائی مضامین

والدِ بزرگوار

علی اشرف صاحب مرحوم

مدیر روزنامہ تنظیم

کے نام

# ـــــ کچھ بیاں اپنا!

"اور کچھ بیاں اپنا" میری دوسری تصنیف ہے، جس میں ۱۹۶۵ء — اور ۱۹۷۵ء کے دوران میں تحریر کردہ تنقیدی اور ریڈیائی مضامین کا انتخاب شامل ہے۔ میری پہلی کتاب "مخمخم —— ایک مطالعہ" ۱۹۶۷ء کے آخر میں شائع ہوئی تھی، اور اب بارہ سال بعد "اور کچھ بیاں اپنا" منظرِ عام پر آرہی ہے۔ زیرِ نظر کتاب کی جو ضخامت ہے، اس کے مقابلہ میں دوچند ضخامت کی کتاب بھی شائع ہو سکتی تھی، لیکن میں نے فی الوقت متذکرہ مُدت کے دوران میں لکھی گئی اپنی تحریروں کے انتخاب کو شائع کرنا ہی مناسب سمجھا۔

اِس کتاب کا پہلا مضمون "محمد قلی کی شخصیت اور شاعری" ماہنامہ "پُونم" کے اکتوبر ۱۹۶۵ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ "غالب کا حُسنِ طلب اور حُسنِ اعراض" —

'شگوفہ' کے غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں اور "ترجمہ اور اُس کی اہمیت" 'نیا دور' لکھنؤ کے شمارۂ نومبر ۱۹۷۱ء میں شامل تھا۔ "اقبال اور تصورِ وطنیت" جو کئی رسائل میں شائع ہو چکا ہے، پہلی بار ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا تھا۔ "ڈاکٹر زورؔ اور ان کے تحقیقی کارنامے" کے زیرِ عنوان مضمون ۱۹۷۵ء میں ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے زیرِ اہتمام منعقدہ "یومِ زورؔ" کے موقع پر ایوانِ اُردو حیدرآباد میں پڑھا گیا تھا جو "سب رس" میں بھی شائع ہوا۔ اُردو کے نامور شاعر اور عوامی رہنما مخدوم محی الدین مرحوم پر اس کتاب میں تین مضامین شامل ہیں۔ تینوں مضامین تاثراتی نوعیت کے ہیں۔ اس مختصر کتاب میں ان مضامین کو شامل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ میں پہلے پہل اپنے مطالعہ مخدوم کی وجہ سے ہی ادبی دُنیا میں متعارف ہوا ہوں اور شاید اپنی پہلی کتاب "مخدوم ــــ ایک مطالعہ" کے توسط سے ہی تھوڑا بہت جانا پہچانا جاتا ہوں۔ یہ مضامین اس مطالعہ کے تسلسل کو ظاہر کرتے ہیں۔ "مخدوم ایک ادھورا مطالعہ" مخدوم کے انتقال کے بعد قلمبند کیا گیا تھا جو "نیا آدم" کے مخدوم نمبر میں شائع ہوا۔ 'مخدوم ــــ چند یادیں' ــــ روزنامہ 'سیاست' حیدرآباد میں اور ریڈیائی مضمون "مخدوم محی الدین" روزنامہ "رہنمائے دکن" میں شائع ہوا تھا۔

کتاب کے نام کے لیے غالبؔ کے مصرع ؎

'ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا'

کے ایک حصّہ کو تھوڑے سے تصرّف کے ساتھ اپنایا گیا ہے۔ لفظ "پھر" میں تبدیلی ضروری تھی۔ غالبؔ جیسا عظیم فن کار اپنے اندازِ بیان کے لیے بجا طور پر "پھر" کا استعمال کر سکتا تھا، لیکن مجھ جیسے لکھنے والے کے لیے "پھر" کی بجائے "کچھ" کا اظہار ہی بہت کچھ ہے۔

اُردو کے مصنفین کو عام طور پر یہ شکوہ رہتا ہے کہ جوشِ وجذبہ کی حرارت کے طفیل ان کی کتابیں شائع تو ہو جاتی ہیں، لیکن بے مروّت بازار میں ان کے جگر کے ٹکڑوں کو خریدنے والے مشکل ہی سے دستیاب ہوتے ہیں۔ مَیں اس اعتبار سے خوش نصیب ہوں کہ میری پہلی کتاب "مخدوم ــــ ایک مطالعہ" کی دو ہزار جلدیں شائع

ہوئی تھیں اور اب میرے پاس صرف چند جلدیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔ لیکن یہ صورتِ حال میرے زورِ قلم یا حُسنِ بیان کا نتیجہ نہیں۔ یہ سارا جادو لفظ "مخدوم" کا ہے۔ یہ ساری کشش اُس ممتاز شاعر اور عوامی رہنما، اُس کی شخصیت اور فن سے تعلق رکھتی ہے۔ میری دوسری پیش کش "اور کچھ بیاں اپنا" کے لیے اگر مجھے اظہارِ پسندیدگی کے کچھ بول بھی میسر آجائیں تو مَیں اُسے بھی اپنی خوش نصیبی پر محمول کروں گا۔

میری پہلی کتاب کا دیباچہ جناب باگا ریڈی نے تحریر کیا تھا جو اُس وقت انجمن تحفظ اُردو آندھرا پردیش کے صدر تھے۔ آج وہ ریاست آندھرا پردیش کے وزیر پنچایت راج اور ریاستی اُردو اکیڈمی کے صدر ہیں۔ اِس محبِ اُردو کی پُرخلوص رہنمائی میں اور جناب چندر سری واستوا جیسے بے لوث، پُرجوش اور فعال سکریٹری ڈائرکٹر کی اَنتھک کاوشوں کے نتیجے میں آندھرا پردیش میں اُردو زبان و ادب کے تحفظ، ترقی اور اشاعت کے لیے حالات اور بھی سازگار بن چکے ہیں، جس سے اُردو زبان اور ادب کے خدمت گزاروں کے حوصلے یقیناً بلند ہوگئے ہیں۔

جناب سید مصطفیٰ کمال مدیر 'شگوفہ' کی گوناگوں مصروفیات کو دیکھتے ہوئے میں اپنی کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں اُن پر مزید کام کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا تھا، لیکن اپنی ابتدائی کوششوں میں ناکامی کے بعد مجھے اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ اُن سے دیرینہ اور گہرے مراسم کے پیشِ نظر اُن کے تعاون کے لیے یہاں روایتی اور رسمی انداز میں اظہارِ تشکر نہ تو مناسب معلوم ہوتا ہے اور نہ ضروری حسابِ دوستاں دردِل ...

کتابت کے لیے مخلص و محنتی خوشنویس، محمد غالب، ٹائٹل کے لیے اپنی طرز کے منفرد حسن کار غوث محمد اور طباعت کے لیے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، ان سب کا میں شکر گزار ہوں۔

ناشکر گزاری ہوگی، اگر مَیں اِس بات کا اعتراف نہ کروں کہ ـــــ اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی مالی اعانت، کتاب کی اشاعت کے لیے ممد و معاون رہی۔

میں اپنی یہ کتاب والد بزرگوار علی اشرف صاحب مرحوم مدیر روزنامہ "تنظیم" کے نام معنون کرتا ہوں، کیوں کہ لکھنے پڑھنے کی عادت مجھے ان ہی سے ورثہ میں ملی ہے اور اس سے زیادہ بیش قیمت اثاثہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

داؤد اشرف

۲۰ مارچ ۱۹۸۰ء
سلطان پورہ
حیدرآباد

# محمد قلی کی شخصیت اور شاعری

محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کو اس کی شاعری کے آئینہ میں دیکھنا بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت بہت مشکل ہے کیونکہ اس کی شاعری میں ایک شاعر کے جذبات اور محسوسات کی جھلک ہی نظر نہیں آتی بلکہ زندگی اور زندگی کے حسن کی ہر ہر ادا اور بانکپن پر سو سو طرح سے نثار ہونے والے آرٹسٹ کا دل بھی دھڑکتا ہوا نظر آتا ہے۔

ایک عظیم تہذیب کے بانی، حکمران و عاشق کے مختلف روپ اور مختلف صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی شاعری میں دریا کی سی وسعت ہے۔ جس کا خود اس کو بھی پورا پورا احساس ہے جس طرح ہر وقت دریا میں موجیں اٹھتی رہتی ہیں اور اس کے باوجود اس کی روانی میں فرق نہیں آتا۔ اسی طرح اس کے ذہن میں بھی تخلیقی عمل کی موجیں ہمیشہ اٹھتی رہتی ہیں اور ہزاروں اشعار موزوں کرنے کے بعد بھی شاعر کی طبیعت کی روانی متاثر نہیں ہوتی۔

اُردو کے اس پہلے صاحب دیوان شاعر کی شخصیت سے جب تک

ہمیں مکمل طور پر آگاہی نہیں ہو جاتی ہم اس کی شاعری کے تنقیدی جائزے میں انصاف نہیں کر سکیں گے۔ محمد قلی قطب شاہ بظاہر ایک جلیل القدر بادشاہ ہے جسے دنیا کی تمام آسائشیں اور نعمتیں، عیش و آرام، نیک نامی، شہرت، عظمت و رفعت، شان و شوکت و دبدبہ جاہ و جلال سب کچھ نصیب ہے۔ مہ جبینوں، حسینوں اور رقاصاؤں کی دلنوازیاں، حسن و شباب کی انگڑائیاں اور دل فریبیاں اس کی ایک نگاہ توجہ کی محتاج ہیں۔ مغنیہ کے نغمہ کی ہر گونج، ترنم کی مٹھاس، نرمی اور حلاوت سب اس کی ایک جنبشِ لب کے آرزومند ہیں۔ یہ تمام باتیں اس کی شخصیت کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن بقول پروفیسر احتشام حسین محمد قلی کی وہ "درویشانہ ادا" ہمارے لیے زیادہ اہمیت رکھتی ہے جو اس کے تہذیبی اور ادبی کاموں میں جلوہ گر ہے اس نے سچی ہندوستانی روح کو اپنے اندر جذب کر لیا تھا اور اپنی دُور رس نگاہوں سے اس ہندوستان کو دیکھ لیا تھا جو آج وہ بننا چاہتا ہے۔

محمد قلی کی زندگی اور شاعری کے بارے میں ہماری معلومات کچھ سال پہلے تک نہ ہونے کے برابر تھیں۔ ڈاکٹر زور مرحوم نے "کلیات قلی" سے ہمیں روشناس نہ کرایا ہوتا تو اردو کے ادبی اور لسانی ارتقا کے اہم زینہ اور ایک بنیادی کڑی سے ہم ناواقف ہی رہتے۔ زور مرحوم کے اس کارنامے نے اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں ایک ناقابلِ فراموش باب کا اضافہ کیا۔ لیکن تحقیق و تجسس کرنے والوں کے لیے ابھی بہت کام باقی ہے۔ محمد قلی کی شخصیت سے جو افسانے وابستہ ہیں ان کی حقیقت کا پتہ لگانا اور جو روایتیں چلی آ رہی ہیں ان میں صداقت کی تلاش اُردو ادب کا ایک اہم تقاضہ ہے۔ اس کے بعد ہی ہم محمد قلی کی شاعری پر تنقید کا صحیح حق ادا کر سکیں گے۔ تنقید ایک مشکل فن ہے۔ شاعری جیسے فن لطیف پر تنقید اور بھی مشکل کام

ہے۔ محمد قلی کی شاعری پر تنقید کے لیے محمد قلی قطب شاہ کے شعور کا مکمل تاریخی جائزہ لینا ہوگا۔ اس کے دور کی تہذیب پر نظر رکھنی ہوگی۔ اس کے تخلیقی ذہن کی نفسیات کا صحیح اندازہ لگانا ہوگا جو ہمارے لیے بہت مشکل ہے۔ ہم کیونکر یہ تصور کرلیں کہ زندگی کا ہر عیش و آرام میسر ہونے کی وجہ سے محرومی کا کوئی گلہ ہی نہ ہوگا۔ تنہائی کا احساس صرف بند کمرہ ہی میں نہیں ہوتا بلکہ بھری محفل میں بھی ہوا کرتا ہے۔ بازار کی چہل پہل اور رونق میں روح کی تنہائی اور تشنگی کبھی کبھی زیادہ شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔ حسن کے جلوے ہمیشہ نظروں کے سامنے بکھرے ہوئے ہونے کے باوجود محمد قلی کی آنکھیں حسن کی اس ایک ادا کے لیے بھی بے چین ہوسکتی ہیں جو آرٹسٹ محمد قلی کے دل پر انمٹ نقش چھوڑ کر شعری تخلیقات کے بے شمار لمحوں میں اس سے دور ہو گئی ہو اور جس کے لیے شاید چڑھتے دریا کی طوفانی موجوں میں بھی گھوڑا لے کر کود پڑا ہو، گویا کچے گھڑے کے سہارے" طوفانی دریا کو عبور کرنے کی کوشش کی ہو۔ بادشاہ ہوتے ہوئے اپنے عشق کو جنون کی آخری حدوں تک لے جانے والے کردار کی نفسیات کا تجزیہ ناممکن نہ سہی لیکن دشوار ضرور ہے۔

محمد قلی کی شاعری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ نہ صرف اس کی منظوم سوانح حیات ہے بلکہ اس کے عہد کی ایک تاریخ بھی ہے اس لیے ہمیں اپنی محدود معلومات کے سہارے ہی احتیاط کے ساتھ اس بحر ناپیدکنار کی موجوں کو گننا ہوگا۔ محمد قلی کے سامنے دکھنی یا قدیم شاعری کے ابتدائی نقوش تھے۔ اس نے سب سے پہلے دکنی زبان میں ادب کو پیش کرنے کی باقاعدہ کوشش کی جس کی وجہ سے اس کو اپنے لیے خود راستے بنانے اور سانچے تیار کرنے پڑے۔ اس اعتبار سے وہ بانی بھی ہے اور موجد بھی اس نے ایجادات بھی کی ہیں اور اجتہاد بھی۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ

ہے کہ ابتدا ہی میں اس کے یہاں انتہا کا ادراک ملتا ہے۔ ابتدا ہی میں اس نے شاعری کے فن کو وسعتیں دی ہیں۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل اور قصیدہ کے علاوہ رباعیاں، قطعات، مثنوی اور مرثیے بھی لکھے ہیں۔ صرف یہ بات نہیں کہ اس نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی رسم نباہی ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انتخاب مضامین کے معاملے میں بھی اس کی شاعری کا کینوس حیرت انگیز حد تک وسیع معلوم ہوتا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری سے روشناس ہونے کے بعد اب ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس کی شاعری کی یہ بنیادی کڑی اتنے طویل عرصے تک ہماری نظروں سے اوجھل نہ رہتی تو اردو ادب اور شاعری کی عظمتوں اور رفعتوں کا آج کس درجہ بلند مقام ہوتا۔ اردو ادب میں جن عناصر کی کمی ہم صدہا برس تک محسوس کرتے رہے ہیں وہ عناصر محمد قلی قطب شاہ اور اس کے بعد کے دور کے دکھنی ادب اور شاعری میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ دکھنی ادب کی ہندوستانی روح، ہندوستانی تصورات، مقامی رنگ، خوب صورتی، بانکپن اور تنوع کا اندازہ اگر بہت پہلے ہو جاتا تو اردو ادب اور شاعری بہت پہلے ہی ان بلندیوں اور وسعتوں سے ہمکنار ہو جاتی جنہیں وہ آج بھی حاصل کرنے کی سعی میں مصروف ہے۔

محمد قلی کے دور کی زبان سے ہم مانوس نہیں اگر اس بات کو اور لفظی متروکات اور ناہمواری کو نظر انداز کر دیا جائے تو اس کے شعری ترنم، موسیقیت، اثر اور دل نشینی کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ اس کے سامنے اصناف سخن کے سانچے موجود نہیں تھے۔ اس لیے اس کی طبع رواں تجربوں اور ایجاد و اختراع کی طرف مائل تھی۔ اس کے لیے یہ کام مشکل بھی نہ تھا۔ ایک طرح سے اسے اس کام بیما جارہ تھا۔ شاعر یا فن کار بنیادی طور پر اپنی ذہنی تسکین اور اپنی روح کی

تشنگی کو دور کرنے کے لیے لکھتا ہے وہ حسن کی تخلیق سے خود محظوظ ہونا چاہتا ہے لیکن اگر اسے یہہ احساس رہے کہ اس کی تسکین دوسروں کی تسکین کا باعث ہو رہی ہے اور اس کے فن سے دوسرے کے احساس کو بھی تازگی اور انبساط حاصل ہو رہا ہے تو وہ بہت متاثر ہو جاتا ہے۔ اس کے جذبہ میں گرمی اور تخیل میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت اسے مزید تخلیقات کے لیے تحریک و ترغیب کا کام دیتی ہے۔

محمد قلی قطب شاہ ایک بڑا شاعر ہی نہیں تھا بلکہ دلوں پر حکمرانی کرنے والا تاج دار بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے چاہنے والے بے شمار تھے بہت سے خوشامدی بھی ہوں گے جو اس کے فن کی عظمت کو سمجھے بغیر بھی محض چاپلوسی اور شاہی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے سر دھنتے ہوں گے۔ لیکن یہہ ایک واقعہ ہے کہ وہ اپنے سننے اور پسند کرنے والوں کی دلبستگی اور اپنے اشعار کی پسندیدگی سے متاثر ہو کر بھی شعر کہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دکھنی میں اس نے پچاس ہزار سے زیادہ شعر کہے تھے اور فارسی اور تلنگی میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔

محمد قلی قطب شاہ کا دور تاریخ کا وہ دور تھا جب مسلمان اپنے آپ کو اجنبی سمجھنے کی بجائے اسی سرزمین کو اپنا وطن اور اسی آب و گل کو اپنا سب کچھ سمجھنے لگے تھے۔ ادب کے معاملہ میں ایرانی روایت، عربی اور ترکستانی نقوش، مسلمانوں کی تہذیب اور ہندوستانی تہذیب، رنگ اور مزاج سے بھرپور عناصر میں جو امتزاج محمد قلی کے عہد کے ادب میں ملتا ہے وہ اکبر کے زمانے کے تہذیبی امتزاج اور آہنگ کے مقابلے میں زیادہ قدرتی، زیادہ حقیقی، زیادہ موثر اور زیادہ دوررس تھا۔ ہندوستان کی تہذیبی اور معاشرتی تاریخ جب بھرپور اور مکمل انداز

میں لکھی جائے گی۔ تب ہم اس تہذیبی امتزاج اور ہم آہنگی کا پورا پورا اندازہ کر سکیں گے۔ اس تہذیبی اور تاریخی پس منظر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمد قلی کی شاعری کے قلب میں ہمیں اس دور کی تہذیبی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں اس کی شاعری میں جہاں حسن و عشق کے معاملات کا بیان ملے گا، وہیں عوام کے معتقدات عیدوں اور تہواروں، بازاروں اور تماشوں، کھیلوں اور عام رسم ورواج کی جھلکیاں بھی دل کش انداز میں ملیں گی۔ اس کے کلام میں درباری شان و شوکت اور محلات کی رنگینیوں کا بیان باغوں کی سرسبزی و شادابی اور شہر کی خوب صورتی اور خصوصیات کی تفصیل درحقیقت اس دور کی تہذیب و تمدن کے نقوش کو اپنی شاعری میں ابھارنے اور چمکانے کی ایک فن کارانہ سعی ہے۔ یہ کام کسی بڑے اور ماہر فن کار کی دوررس نگاہیں ہی انجام دے سکتی تھیں۔ ایک عظیم مشترکہ تہذیب کے بانی کی حیثیت سے اس کی نظر میں جو وسعت ہونی چاہیے تھی وہ اس کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ نظیر اکبرآبادی کا دور محمد قلی کے مقابلہ میں بہت بعد کا دور ہے۔ محمد قلی کے بعد تقریباً ڈھائی سو سال کے عرصہ میں صرف نظیر ہی ایسا شاعر نظر آتا ہے جس نے اپنے دور کی زندگی، تہذیب، معاشرتی طورطریقوں اور رسم ورواج کو اپنی شاعری میں پیش کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔

اگر قلی قطب شاہ کے دور کی دکھنی زبان میں زیادہ جان ہوتی، اونچے معیارات اور موزوں سانچے اس کے سامنے ہوتے تو اس کی شاعری عظیم بن سکتی تھی۔ اس نے اپنی شاعری میں بالعموم سچی تصویر کشی کی۔ اس کا مشاہدہ صحیح تھا لیکن بادشاہ ہونے کی وجہ سے وہ ان تجربات سے گزر نہیں سکتا تھا اور ان واردات سے محروم تھا جو بادشاہ نہ ہونے کی صورت میں اس کے حصہ میں آتیں

اور اس کے غم ذات کا جز بنتیں۔ اس کی شاعری محض تخیل کی شاعری نہیں بلکہ اس کے جمالیاتی شعور کی آئینہ دار تھی۔ اس کا تہذیبی مزاج اس کے شاندار محلوں کی حسن کارانہ سجاوٹ اور آراستگی اس کے خرابوں کے شہر کے حقیقی اور جیتے جاگتے روپ میں ہر جگہ بلندی پر نظر آتا ہے وہ اپنی شاعری میں غیر مبہم انداز میں واضح کر چکا ہے کہ وہ حسن سے متاثر ہو کر ہی شعر کہتا ہے۔ یہ حسن اس کی نازک اندام اور خوبصورت دوشیزاؤں اور ہم جولیوں ہی کا حسن نہیں بلکہ یہ اس تہذیب کا حسن بھی ہے جو اسے عزیز تھی۔ لیکن جہاں تک ماحول کی عکاسی کا تعلق ہے اس کی شاعری میں وہ سب جلوے کوندتے نظر آئیں گے جو اس کے محلوں اور عشرت کدوں کی روشنی تھی اس کے یہاں حسن و عشق کے معاملات کا بیان بے ساختہ ملتا ہے۔ اس نے عورت کے حسن کو اس کی تمام تر کشش اور جاذبیت کے ساتھ پیش کیا ہے وہ نشاط اور سرور اور بہاروں کا شاعر ہے زندگی اور حسن کے مشاہدوں کو جذبہ کی حرارت اور تخیل کی مدد سے شعری تخلیق میں تبدیل کر دینا محمد قلی کے آرٹ کا کمال ہے۔

ایک حکمران ہونے کی وجہ سے محمد قلی کو شاید اتنی فرصت نصیب نہیں تھی کہ وہ سلطنت کی ذمہ داریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی تمام صلاحیتیں اور توانائیاں اپنے فن پر صرف کر سکے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں ایسے اشعار کی تعداد بھی کم نہیں جو محض بھرتی کے شعر ہیں۔ کہیں کہیں لفظوں کے تلفظ میں ناہمواری اور معنی میں اختلاف بھی ملتا ہے الفاظ اور خیالات کی ناگوار تکرار اور بے ربطی بھی کھٹکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اس کے کلام میں فکر کی وہ گہرائی اور اظہار بیان کی وہ صناعی نہیں ملتی جو بعد کے اردو شعراء میں نظر آتی ہے۔ لیکن اس کی بنیادی

وجہ زبان کی ابتدائی مشکل اور کھردراپن ہے اور یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ ہر زبان کے ابتدائی دور میں اس زبان کے لکھنے والوں کو اسی قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ غالب بھی اپنی فکر کی گہرائی کے لیے آج سے سوا سو سال پہلے کی زبان اور شاعری کے فارم کی تنگ دامانی کے شاکی تھے۔ محمد قلی کو تو بہ مشکل دامن تھامنے ہی میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس کا دور تقریباً پونے چار سو سال پہلے کا دور ہے۔ فکر میں گہرائی نہ ملنے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی نظر میں جلوہ ہائے صد رنگ تھے اسی لیے اس کی نگاہ ہر جلوہ کا باریک بینی کے ساتھ مشاہدہ نہیں کر سکی۔ پھر بھی اس کا دل شاعر کا، اس کی نظر مصور کی اور اس کا حوصلہ کوہ کن کا تھا۔ اس کا ذہن ایک باتدبیر حکمران اور ایک ایسی تہذیب کے نمائندہ اور رہنما کا ذہن تھا جس کی رہنمائی فنونِ لطیفہ کی ترقی کی ضامن تھی۔

OO

# غالب کا حُسنِ طلب اور حُسنِ اعراض

غالبؔ کی شاعری اور نثر کی نمایاں خصوصیات ان کی دلاویز شخصیت کے کئی پہلو اجاگر کرتی ہیں۔ ان کی عظمت کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ وہ ہر رنگ میں حتیٰ کہ "تصویر کے پردہ میں بھی" اپنے اندر کے حیوانِ ظریف کو چھپاتے نہیں عریاں کر دیتے ہیں۔

غالب نے شاعری کو قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی سمجھا۔ اپنی شاعری کو عظیم عالمی شاعری کے درجہ تک پہنچایا اور اس کو ہمارا اہم تہذیبی ورثہ بنایا اور مکتوب نویسی کے ابتدائی دور ہی میں انوکھا، رواں اور بے تکلفانہ طرزِ تحریر اختیار کر کے ایسا رنگا رنگ چمن اگایا جس کے پھول اب تک تازہ و شگفتہ ہیں اور بہار دے رہے ہیں۔

میرزا نے پابندیٔ رسم و رہ عام سے ساری زندگی گریز کیا۔ فرسودہ اور روایتی ڈگر پر چلنے کی بجائے جدّت پسندی سے کام لیا۔ ان کی یہ خصوصیت ان کے یہاں طلب اور اعراض میں بھی نمایاں ہے۔ راست طور پر وہ کوئی چیز کم

مانگتے ہیں۔ ان کے خطوط شاعری یا لطیفوں میں حُسنِ طلب کی اکثر مثالیں ملتی ہیں۔ اگر طلب راست انداز میں ہو اور مانگنے کا ڈھنگ سادہ اور سپاٹ ہو تو اس میں بے لطفی پیدا ہو جاتی ہے۔ میرزا کی فطری ظرافت و شوخی، بات کہنے کا نرالا ڈھنگ، بات میں بات پیدا کرنے کی کوشش نے طلب میں ایک خاص لطف و خوبی پیدا کر دی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس خاص انداز میں طلب کرتے ہیں کہ انکار بن نہیں پڑتا۔

میرزا صرف مانگنا اور طلب کرنا ہی نہیں جانتے تھے دوسروں کی ضرورت اور خواہش پورا کرنا بھی خوب جانتے تھے۔ جہاں انھوں نے اپنے رشتہ داروں، دوستوں اور شاگردوں سے سوال کیا ہے۔ وہیں انھوں نے ان لوگوں یا دیگر لوگوں کی فرمائشیں پورا کرنے میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ عمر کے آخری حصّہ میں بیماری اور ضعف پیری کے باعث بستر پر لیٹے لیٹے شاگردوں کا بھیجا ہوا کلام پڑھتے اور اصلاح دیتے۔ اپنے دوستوں اور شاگردوں کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ ان کی خوشی پر مسرور اور ان کے دکھ درد پر رنجیدہ ہو جاتے تھے۔ بعض اوقات ان کے احباب اور شاگرد ایسی فرمائشیں کر بیٹھتے تھے جنھیں پورا کرنے میں کسی وجہ سے انھیں تامل ہوتا تو ایسی صورت میں وہ ایک خاص انداز میں پہلو بچانے کی کوشش کرتے۔ کیونکہ وہ محبت اور مروت کے پیکر تھے اور اپنی کسی بات سے دوسروں کو رنجیدہ نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس لیے وہ جواب میں عام طور پر صاف انکار سے پرہیز کرتے ہیں اور بات ٹالنے کے لیے کوئی نہ کوئی دلچسپ نکتہ ڈھونڈ ھ نکالتے ہیں۔ جب کسی کی فرمائش پورا کرنے میں وہ خود کو معذور پاتے ہیں یا کسی کے ارادہ کو ناپسند کرتے ہیں تو ایسی صورت میں مکتوب الیہ کو فرمائش

یا ارادہ سے باز رکھنے کے لیے مشورہ و نصیحت کرتے ہیں۔ لیکن ان کا مشورہ کڑوی دوا کی مانند نہیں ہوتا جسے پینے سے منہ کا ذائقہ بگڑتا ہے یا منہ بنانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ بات ظرافت کے پردے میں کہتے ہیں تاکہ ناگوار نہ گزرے اور بدمزگی پیدا نہ ہونے پائے۔

ظرافت غالب کی شخصیت کا ایک اہم ترین وصف ہے۔ شوخی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ یہ شوخی و ظرافت خاص خاص موقعوں اور موضوعات کی پابند نہیں۔ میرزا کسی بھی واقعہ یا بات میں اس کے مضحک یا تفریحی پہلو ابھارتے ہیں۔ دکھ درد کا تذکرہ ہو کہ رنج و افسردگی کا بیان، ان کا قلم شوخی اور روانی کو نہیں بھولتا۔ غم کے موقع پر آزردہ اور رنجیدہ خاطر ہو کر وہ آہ و بکا نہیں کرتے بلکہ اس میں مزاح کا پہلو نکال کر غم کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بستر علالت اور بستر مرگ سے بھی جو خطوط انھوں نے تحریر کیے ہیں ان میں میرزا کی فطری ظرافت اور شگفتگی اپنا جوہر دکھاتی ہے۔ سخت سے سخت اور مشکل سے مشکل حالات میں مذاق کا سوجھنا غالب جیسے حیوان ظریف ہی کا حصہ ہے ان کے اردو خطوط کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مکتوب الیہ کو خوش کرنے اور اس کے دل بہلانے کا التزام کیا ہے۔ اس سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ میرزا کو اس اہم سماجی ذمہ داری کا پورا پورا احساس تھا اور وہ اس ذمہ داری سے پوری کامیابی کے ساتھ عہدہ برا ہوئے ہیں۔ میرزا نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ وہ اس سے بھی چند قدم آگے نکل گئے ہیں۔ دوسروں کا مذاق اڑانا آسان ہے۔ لیکن خود پر ہنسنا یا خود کو مذاق کا نشانہ بنانا، اعلیٰ ظرفی اور بلند حوصلگی کی بات ہے۔

ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس "حیوان ظریف" کی فطری ظرافت طلب اور اعراض

میں کس حد تک ان کا ساتھ دیتی ہے۔ دیکھیے آیا وہ اونچی آواز اور کرخت لہجے میں
صدا بلند کرتے ہیں یا دل چسپ اور دل لبھانے والے انداز میں سوال کر کے
حاجت روا کو مسرور اور مسخر کر لیتے ہیں۔ کسی کی فرمائش کو بے مروتی سے رد کر دیتے
ہیں یا ظریفانہ انداز اختیار کر کے پہلو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں
طلب اور اعراض میں بھی ظرافت، شگفتگی اور ذہانت جلوہ گر ہے جس میں مزاح
کی ہلکی ہلکی آمیزش شگفتگی اور جدت پسندی نے ایک انوکھا پن پیدا کر دیا ہے۔

شاعری میں وہ "در کعبہ وا" نہ ہونے پر ضرور لوٹ آئیں گے ــــ لیکن
اپنے خطوط میں اور خصوصیت کے ساتھ طلب یا اعراض کے لمحوں میں وہ زندگی کے
حقائق اور واقعیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ حاجت روا کا در وا نہ ہونے پر اسے
بار بار کھٹکھٹانے کی حرکت کر سکتے ہیں۔ ان لمحوں میں شخصیت سے فرار بھی ممکن
ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا ان لمحوں میں وہ اپنے رکھ رکھاؤ اور وضع داری کو نبھاتے
ہیں یا صرف غرض مند سوالی بن جاتے ہیں شاعری کے مقابلہ میں خطوط کے توسط
سے غالب کی شخصیت، کردار اور زندگی کو سمجھنے میں زیادہ مدد ملتی ہے طلب اور
اعراض کے مواقع اس معاملہ میں خصوصیت کے ساتھ زیادہ اہمیت کے حامل
بن جاتے ہیں۔ یہاں تصنع، بناوٹ، خوشامد پسندی، ظاہر داری اور اس کے ساتھ
ہی ساتھ اعلیٰ ظرفی، طبیعت کی فطری شوخی، خودداری، انانیت، مزاج کا بانکپن
اور لہجہ کی شگفتگی غرض یہ کہ یہ تمام خصوصیات اور ان کے تضادات کا تجزیہ اور
یہ طے کرنا کہ آیا یہ حالات کی ستم ظریفی غالب جیسے ایک عظیم فن کار کی ٹریجڈی،
مایوسی اور محرومی کو ظاہر کرتی ہے یا ان کی شخصیت کے کھوکھلے پن اور قول
و فعل کے تضاد کو بے نقاب کرتی ہے ایک علیحدہ موضوع ہے۔ یہ مضمون طلب و

واعراض کی صرف اس خصوصیت تک محدود ہے جو اس حیوانِ ظریف کی فطری شوخی، مانگنے اور انکار کرنے کے دل چسپ سلیقہ شگفتہ انداز اور ان سب پر چڑھے ہوئے ہلکے ہلکے ظرافت کے رنگ سے متعلق ہے۔ جس پر کہیں کہیں تیکھے طنز کی چمک ملتی ہے، مزاح کے گل بوٹے بھی جس پر نقش ہیں۔ یہی غالب کی منفرد خصوصیت ہے۔ سپاٹ یا بناوٹی قسم کے روایتی انداز سے ہٹ کر انھوں نے جداگانہ روش یہاں بھی اختیار کی ہے۔ اسی انوکھے پن نے ان کی نثر میں شعر کی سی مترنم روانی پیدا کر دی ہے۔

حسنِ طلب اور حسن اعراض کی چند مثالیں جو کہ بیشتر خطوط سے لی گئی ہیں پیشِ خدمت ہیں:

علاء الدین احمد خاں کے نام یہ خط حسنِ طلب ہی کا نہیں غالب کی دل کش طرزِ تحریر کا ایک بہترین نمونہ ہے خط ملاحظہ فرمائیے:

"یہاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں پاخانہ ڈھے گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمہاری پھوپی کہتی ہیں۔ ہائے دبی، ہائے مری۔ دیوان خانہ کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدانِ راحت سے گھبراتا ہوں۔ چھت چھلنی ہے ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے مرمت کرے تو کیونکر کرے۔ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثنائے مرمت میں، میں بیٹھا کس طرح رہوں؟ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی، جس میں میر حسن رہتے تھے اپنی پھوپی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالاخانہ مع دالان زیریں جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا۔ میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گذر جائے گی۔ مرمت

ہو جائیگی۔ پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ[1] اپنے قدیم مسکن میں آرہیں گے۔
تمہارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں ایک یہہ
مروّت کا احسان میرے پایان عمر میں اور بھی سہی۔"[2]

اس خط میں طنز، ظرافت اور ہجو کا انداز ملتا ہے۔ یہ ہجو کسی اور کی نہیں ان کے اپنے مکان کی ہے اس طرح یہ اپنے حال زار پر ہنسنا بھی ہے۔ بیان کا انداز ظریفانہ ہے۔ غالب کا یہ بیان کہ مرنے سے نہیں ڈرتے فقدان راحت سے گھبراتے ہیں۔ ان کے کردار اور وضع داری کی طرف اشارہ ہے۔ اس خط میں گذارش احوال واقعی" اور انداز طلب دونوں باوقار ڈھنگ سے ملتے ہیں۔

غالب نے کسی نواب کے یہاں سے اپنے خط اور قصیدہ کا جواب نہ آنے پر ایک دل چسپ قطعہ لکھا ہے جو حسن طلب کا ایک شاہکار ہے۔ اس قطعہ میں انھوں نے ایک چھوٹی سی تمثیل بنائی ہے۔ اس تمثیل میں غالب مایوس ہو کر اپنی عقل کو مخاطب کرتے ہیں کہ وہ شمع چراغ ہفت الوان ہے۔ اسے تو کچھ خبر ہوگی کہ خط کا جواب کیوں نہیں آیا۔ غالب کے استفسار پر جو خط اور قصیدہ لکھنے پر پشیمان تھے۔ عقل نے جواب دیا شیطان کا فریب نہ کھاؤ اور مایوس نہ ہو۔ اصل میں نواب ارمغان کی فکر میں ہے اور جو کچھ وہ دینا چاہتا ہے اس کے اکٹھا کرنے میں دیر ہو رہی ہے۔ نواب نے تو یہ فرمان جاری ہی کر دیا ہے کہ بحر و بر کے تمام راستوں سے پوری کوشش کر کے

---

[1] غالب ان کی بیگم اور بچے

[2] خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر ص ۸۹

دمشق سے دیبا، روم سے مخمل، معدن سے الماس، کان سے سونا، دکن سے ہاتھی، کوہستان سے زمرد، عراق سے گھوڑا، عمان سے موتی، نیشاپور سے فیروزہ، بدخشاں سے یاقوت، بغداد سے اونٹنی، اصفہان سے تلوار، کشمیر سے پشمینہ، ایران سے زربفت فراہم کرکے لائیں۔ ظاہر ہے اس سارے اسباب کے اکٹھا کرنے میں دیر ہوتی جا رہی ہے۔ جب عقل نے انھیں اس طرح تسلی دی تو ان کی مایوسی امید میں بدل گئی اور وہ اپنے دل میں کہتے ہیں کہ جب ممدوح میرے لیے یہ سب کچھ کرنا چاہتا ہے تو میں بھی اس کے لیے سکندر سے تاج اور آئینہ سلیمان سے تخت اور انگوٹھی، عالم غیب سے جام جمشید، چشمہ خضر سے آب حیوان، عمر ابد، نشاط جاوید، دل کی توانائی اور ایمان کی سلامتی اپنے خدا سے اپنی عرضی کا جواب اور قصیدہ کا صلہ ممدوح سے کیوں نہ مانگوں۔"[1]

میرزا آموں کے بہت دلدادہ تھے۔ آم کے موسم میں ان کے دوست احباب انھیں عمدہ عمدہ آم بھیجتے تھے اور وہ خود بھی دوستوں سے آم بھیجنے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ میرزا نے جو فارسی خط علی اکبر متولی امام باڑہ ہگلی بندر کو آموں کی طلب میں لکھا تھا وہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

"کسی قدر پیٹ کا بندہ ہوں اور کسی قدر ناتواں۔ آرائش خواں چاہتا ہوں اور آرائش جاں بھی۔ عقلمند جانتے ہیں کہ یہ دونوں صفتیں آم کے اندر موجود ہیں اور اہل کلکتہ کا دعوی ہے کہ ہگلی بندر قلمروانبہ ہے۔ ہاں ہگلی سے آم گلشن سے گل، جناب سے ایثار

---

[1] سبد چیں سے ترجمہ، (طبع اول ص ۳۶)

اپنی جانب سے سپاس۔ شوق یہ چاہتا ہے کہ ختم موسم تک دو تین بار خاطر ولی نعمت سے یہ بات گزرے اور حرص یہ روتی ہے حاشا اس قدر میوہ خوری پر بھی میں خوش نہیں ہوں گی۔"[1]

غالب نے کہا تھا

اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

اس خط میں یہی خواہش آم کے تعلق سے اور آم بھیجنے والے کے تعلق سے پائی جاتی ہے۔ طلب کرنے والے کا یہ انتہائی دل چسپ انداز ہے اس حسن طلب کے کیا کہنے:

"ایک روز مرحوم بہادر شاہ آموں کے موسم میں چند مصاحبوں کے ساتھ جن میں میرزا بھی تھے باغ حیات بخش یا مہتاب باغ میں ٹہل رہے تھے۔ آم کے پیڑ رنگ برنگ کے آموں سے لدے ہوئے تھے۔ یہاں کا آم بادشاہ یا سلاطین یا بیگمات کے سوا کسی کو میسر نہیں آسکتا تھا۔ میرزا بار بار آموں کی طرف غور سے دیکھتے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا میرزا اس قدر غور سے کیا دیکھتے ہو؟ ہاتھ باندھ کر عرض کیا "پیر و مرشد جو کسی بزرگ نے کہا ہے

برسرِ ہر دانہ بنوشتہ عیاں

کایں فلاں ابن فلاں ابن فلاں

اس کو دیکھتا ہوں کہ کسی دانے پر میرا اور میرے باپ دادا کا نام بھی لکھا

---

[1] پنج آہنگ سے ترجمہ

ہے یا نہیں"۔

بادشاہ مسکرائے اور اسی روز ایک بہنگی عمدہ عمدہ آموں کی مرزا کو بھجوائی"۔[1]

اس واقعہ میں ہی حسن طلب کی داد بہادر شاہ ظفر کی طرف سے میرزا کو آموں کے تحفہ کی شکل میں مل جاتی ہے۔ غالب اپنے حسن طلب کے ذریعہ کیا حاصل نہیں کر سکتے۔

نواب یوسف علی خاں بہادر نے حیدر علی خاں بہادر کی شادی کے موقع پر خلعت و تورہ کے لیے میرزا کو ۲۵ اروپے بھیجے تھے۔ میرزا نے ان روپیوں کو خرچ کر لیا اور آئندہ کی سبیل نکالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ تحریر نہیں مکالمہ ہے۔ گستاخی معاف کروا کے اور آپ سے اجازت لے کے بطریق انبساط عرض کرتا ہوں کہ یہ سوا سو روپے جو تورہ و خلعت کے نام سے مرحمت ہوئے ہیں، میں کال کا مارا اگر یہ سب روپیہ کھا جاؤں گا اور اس میں لباس نہ بناؤں گا تو میرا خلعت حضور باقی رہے گا یا نہیں ؎

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

دار کا طالب

غالب[2]

یہ دل چسپ طرز تحریر واقعی تحریر نہیں مکالمہ ہے۔ طلب میں مزاح کا

---

[1] یادگار غالب از حالی صفحہ ۵۲

[2] مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی، طبع سوم صفحہ ۲ مکتوب نواب فردوس مکان مکتوب نمبر ۲۴

پہلو انوکھا بھی ہے اور موثر بھی۔ ایسے حسن طلب کے بعد شاید ہی کوئی انکار کرے۔

نواب یوسف علی خاں بہادر والی رامپور کے انتقال کے بعد کلب علی خاں بہادر مسند نشین ہوئے۔ میرزا نے کلب علی خاں بہادر کی مسند نشینی کی مسرت میں قصیدہ تہنیت لکھ بھیجا تھا۔ لیکن وہاں سے صلہ پانے میں تاخیر ہوی تو وہ والی رام پور کو لکھتے ہیں۔

"پیر و مرشد! حضرت فردوس مکان کا دستور تھا کہ جب میں قصیدہ بھیجتا اس کی رسید میں خط تحسین و آفرین کا، شرم آتی ہے۔ کہتے ہوئے مگر کہے بغیر بنتی نہیں، مالصہ کی ہنڈوی اس خط میں ملفوف ہوا کرتی تھی ...... یہ رسم بری نہیں اگر جاری رہے تو بہتر ہے۔" [۱]

اس خط میں طلب تقاضہ بن چکی ہے لیکن طلب کا انداز شاعرانہ ہے۔ "یہ رسم بری نہیں اگر جاری رہے تو بہتر ہے" سے خودداری ٹپکتی ہے۔ غالب طلب اور تقاضا کے شدید لمحات میں اپنے مقام اور مرتبہ کو یکسر فراموش نہیں کر دیتے

میرزا قرضوں کے باعث بے حد پریشان رہا کرتے تھے۔ والی رام پور نواب کلب علی خاں بہادر سے وہ راحت کے طلبگار ہیں۔ ان سے وہ نہ صرف قرض کی رقم مانگتے ہیں بلکہ مستقل تنخواہ میں بھی اس قدر اضافہ چاہتے ہیں کہ انہیں اپنے اخراجات کی پابجائی کے لیے آئندہ قرض نہ لینا پڑے۔ خط ملاحظہ کیجیے۔

حضور ملک و مال جس کو جس قدر چاہیں عطا کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے صرف راحت مانگتا ہوں اور راحت منحصر اس میں ہے کہ قرض باقی ماندہ ادا ہو جائے اور آئندہ قرض لینے کی حاجت نہ پڑے [۲]

---

[۱] مکاتیب غالب از مرتبہ امتیاز علی خاں عرشی طبع سوم ص ۳۷

[۲] " " " " " ص ۶۱

ان دو جملوں میں بات کہنے کا سلیقہ ہے لیکن باوقار انداز اور میرزا کے مخصوص شگفتہ انداز اور لہجہ میں نثر میں یہ "طلب" شاعری سے کم نہیں۔

عارف کے چھوٹے بیٹے حسین علی خاں کی شادی کے اخراجات کے لیے میرزا نے نواب کلب علیخاں کے پاس درخواست بھیجی تھی۔ شادی رجب میں مقرر تھی جواب نہ ملنے پر ملتوی کردی گئی۔ میرزا ۹ر مارچ ۱۸۶۸ء کو تقاضا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرزا حسین علی خاں کی شادی رجب کے مہینے میں قرار پائی تھی۔ عطیہ حضور کے نہ پہنچنے کے سبب ملتوی رہی۔ آج جو ذی قعدہ کی ۱۵ ہے۔ ۱۵ دن یہ اور مہینا ذی الحجہ کا۔ اگر اسی ذیقعدہ کے مہینے میں کچھ حضرت عطا فرمائیں گے تو آخر ذی الحجہ تک نکاح ہو جائے گا۔ خدا کرے! خداوند کے ضمیر میں یہ بھی گذرے کہ غالب جب بہو بیاہ لائے گا تو اس کو روٹی کہاں سے کھلائے گا۔ غرض اس سے یہ ہے کہ حسین علی خاں کی تنخواہ جاری ہو جائے۔ حضرت! کوئی ایسا نہیں کہ جو میرے مطالب حضور میں عرض کرتا ہے اور مجھے بار بار لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔

اس خط سے شدید ضرورت، حاجت اور موقع کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود میرزا نے روایتی انداز اختیار نہیں کیا۔

حالی نے یادگار غالب میں جو واقعہ، لطیفہ کے زیر عنوان بیان کیا ہے وہ حسنِ طلب کی ایک مثال ہے۔

"ایک دن دیوان فضل اللہ خاں مرحوم حریٹ میں سوار میرزا کے مکان کے پاس سے بغیر ملے نکل گئے۔ میرزا کو معلوم ہوا تو انھوں نے ایک رقعہ دیوان جی کو لکھا: "آج مجھ کو اس قدر ندامت ہوئی ہے کہ شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا نالائقی

ہو سکتی ہے کہ آپ کبھی نہ کبھی تو اس طرف سے گذریں اور میں سلام کو
حاضر نہ ہوں۔" جب یہ رقعہ دیوان جی کے پاس پہونچا وہ بہت
شرمندہ ہوئے اور اسی وقت گاڑی میں سوار ہو کر مرزا صاحب سے
ملنے کو آئے"۔ [1]

اس واقعہ میں غالب کے طنز کا تیکھا پن ملتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ندامت غالب کو نہیں ہوئی بلکہ فضل اللہ خاں صاحب کو ہوئی۔ اور غالب کے طنز نے ان میں شدید ردعمل پیدا کرنے کی بجائے کچے دھاگہ سے باندھ کر انھیں غالب کے یہاں پہنچا دیا۔

میرزا نے ایک بار تفضل حسین خاں سے اپنا دیوان مانگا تھا۔ دیوان نہ دیئے جانے پر خفا ہو جاتے ہیں اپنی ناراضگی کا نہایت شائستگی کے ساتھ اظہار کرتے ہوئے دیوان دوبارہ طلب کرتے ہیں۔

"کیوں صاحب

یہ چچا بھتیجا ہونا اور شاگردی اور استادی سب پر پانی پھر گیا؟ اگر کوئی ہزار پانسو کی چیز ہوتی اور میں تم سے مانگتا تو خدا جانے تم کیا غضب ڈھاتے، میرا کلام خریدا آٹھ دس روپیہ کی سو وہ بھی میں نہیں کہتا کہ مجھ کو دے ڈالو۔ تم کو مبارک رہے مجھ کو مستعار دو۔ میں اس کو دیکھ لوں، پھر تم کو واپس بھیج دوں۔ اس طرح کی طلب پر نہ دینا دلیل اس کی ہے کہ مجھ کو جھوٹا جانتے ہو۔ میرا اعتبار نہیں یا یہ کہ مجھ کو آزار دینا اور ستانا بدل مطلوب ہے۔ وہ کتاب ابھی میرے آدمی کو دے دو۔ باللہ واللہ اس میں جو میرے پاس نہیں ہے نقل کر کے تم کو واپس نہ دوں تو مجھ پر لعنت اور تم میری قسم نہ مانو اور کتاب حامل رقعہ کو

---

[1] یادگار غالب از الطاف حسین حالی ص۵۱

نہ دو تو تم کو آفریں ہے[1]

یہ خط جداگانہ نوعیت کا ہے اور اس خط کی تحریر بھی غالب کی نثر کے اچھوتے انداز کی نمائندہ تحریر سمجھی جا سکتی ہے۔ اس خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جن موقعوں پر آدمی جھلا اٹھتا ہے وہاں بھی غالب نے اپنے مزاج کے اعتدال اور شگفتگی طبع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ طنز بھی کرتے ہیں تو گراں نہیں گذرتا اور کسی کے جذبات مجروح نہیں ہوتے۔

منشی ہرگوپال تفتہ فارسی کے شاعر اور میرزا کے بہت عزیز شاگرد تھے۔ اردو میں غالب کے سب سے زیادہ خطوط ان ہی کے نام ہیں۔ انھوں نے ایک بار میرزا سے اپنے دوسرے دیوان پر تقریظ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ اس کے جواب میں میرزا نے جو مکتوب لکھا تھا وہ میرزا کا شاعری کی جانب جو رویہ تھا اس کی واضح طور پر ترجمانی کرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ شاعری قافیہ پیمائی کے لیے وقت گزارنے یا دل بہلانے کی خاطر کی جائے۔ وہ شاعری کے لیے غور و فکر، چھان پھٹک اور خود احتسابی ضروری سمجھتے تھے۔

اس خط میں خاص بات یہ ہے کہ تلقین و تنقید سے متعلق وزنی باتیں اور بیش قیمت مشورے دل چسپ اور برجستہ انداز میں ملتے ہیں۔ یہاں صاف گوئی بھی ہے اور کھری کھری باتیں بھی لیکن اس مخلصانہ انداز میں کہ دل ٹوٹنے نہ پائے

"صاحب!

دیباچہ اور تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان

[1] خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر ص ۴۳۵

لکھ لینا۔ کیوں روپیہ خرچ کرتے ہو اور کیوں چھپواتے ہو؟ اگر یوں ہی جی چاہتا ہے تو ابھی کہے جاؤ۔ آگے چل کر دیکھ لینا۔ اب یہ دیوان چھپوا کر اور تیسرے دیوان کی فکر میں پڑو گے۔ تم دو چار برس میں ایک دیوان کہہ لو گے۔ میں کہاں تک دیباچے لکھا کروں گا؟ مدعا یہ ہے کہ اس دیوان کو اس دیوان کے برابر ہو لینے دو اب کچھ قصیدہ اور رباعی کی فکر کیا کرو۔ دو چار برس میں اس قسم سے جو کچھ فراہم ہو جائے، دوسرے دیوان میں اس کو بھی درج کرو۔[1]

نواب علاء الدین خاں علائی نے میرزا سے اپنے لڑکے کی ولادت کی تاریخ اور اُس کا اسم تاریخی نظم کرنے کی فرمائش کی تھی۔ اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے۔ طریق صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ حسن طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پیر غمزدہ دل کو تکلیف دو۔ علاء الدین خاں، تیری جان کی قسم، میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیئے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے جا پہنچا

---

[1] خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر ص ۱۵۱

نہ صاحب، دہائی خدا کی، میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا، نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔[1]

یہ خط پکار پکار کر کہتا ہے کہ میرزا جدید اُردو نثر کے بانی و خالق تھے۔ اتنی رواں اور حسین نثر آج بھی کا ہے کو دیکھنے کو ملے گی۔ یہ میرزا کا منفرد اسٹائل ہے یہاں انکار ہے پہلوتہی ہے۔ لیکن کس خوبی کے ساتھ۔ انکار میں ایسی تحریر پانے والا انکار کے باوجود اپنے آپ کو خوش نصیب تصور کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس خط میں میرزا کا طنز و مزاح۔ بے ساختہ اور دل کو لبھانے والا انداز بیان۔ غرض یہ کہ سب کچھ مل جاتا ہے۔

"کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

OO

---

[1] خطوط غالب مرتبہ غلام رسول مہر بار سوم ص۲۹۵

# مخدوم ــــ ایک ادھورا مطالعہ

جامعہ عثمانیہ میں ۶۶-۱۹۶۵ء کے تعلیمی سال کے دوران ایم۔اے (آخری) کے امتحان کے لیے جن ادبی شخصیتوں پر مقالے لکھے گئے ان میں مخدوم بھی شامل تھے جنھوں نے جامعہ عثمانیہ ہی سے اردو میں ایم۔اے کیا تھا اور جن کے دورِ طالب علمی میں حیدرآباد کی اس عظیم درس گاہ سے جدید حیدرآباد اور اس کی جدید تہذیب کے نقوش اُبھرے تھے۔ نئی روایات شروع ہوئی تھیں۔ ایک ایسا ماحول پیدا ہوا اور ایک ایسی فضا تیار ہوئی تھی جس نے حیدرآباد کی ساری زندگی کو نئے سانچوں میں ڈھالنا شروع کیا۔

جامعہ عثمانیہ سے اپنے اس گہرے تعلق کی وجہ سے بھی اُردو ادب اور شاعری کی یہ قدآور شخصیت اس بات کی مستحق تھی کہ اس پر اس کے وطن میں ہی اور اس کی اپنی جامعہ میں تحقیق کی جائے۔ ریسرچ کیا جائے۔ اس طرح جامعہ عثمانیہ نے اپنے ایک بہترین فرزند کو اس کی زندگی ہی میں موزوں خراجِ تحسین ادا کیا۔

یہ اگست ۱۹۶۵ء کی بات ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے امتحان ایم۔اے (آخری) کے لیے مجھے بہ حیثیت طالب علم اپنے مقالے کے موضوع کا انتخاب کرنا تھا۔ میرے ساتھی موضوع کے انتخاب کے سلسلہ میں اس وقت کے صدر شعبۂ اُردو ڈاکٹر مسعود حسین خاں سے مشورہ کرنے اور اجازت حاصل کرنے میں مصروف تھے۔ مجھ سے بھی کہا گیا تھا کہ موضوع کے بارے میں سوچ کر ڈاکٹر صاحب سے ملوں۔ مخدوم صاحب کا انتخاب کرنے میں مجھے دیر نہیں ہوئی۔ اسی طرح حصولِ اجازت کا مرحلہ بھی تیزی کے ساتھ طے ہوگیا۔ سب سے پہلے تو میں نے اپنے استاد محترم ڈاکٹر عبد الحفیظ قتیل سے مل کر ارادہ ظاہر کیا تھا کہ میں مخدوم پر کام کرنا چاہتا ہوں۔ میں اُردو کے اس بڑے شاعر اور حیدرآباد کی اس عہد ساز محبوب شخصیت سے بے حد متاثر ہوں اور اس کی شخصیت اور فن کو ہی موضوع بنانا چاہتا ہوں۔ مخدوم کے ماحول سے قریب رہنے اور حیدرآباد کے "رستوں" جلسہ گاہوں اور ادبی ایوانوں میں برسہا برس سے چلنے والے مخدوم کے تذکرے اور چرچے سننے کے بعد مخدوم کے مطالعہ کا خیال میرے لیے فطری تھا۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل نے میرے انتخاب کو پسند کیا۔ یہی نہیں بلکہ قتیل صاحب نے میرے حوصلے بھی بڑھائے۔ اس کے بعد جب میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبہ سے ملا تو ڈاکٹر صاحب نے بھی فی الفور میرے موضوع کو منظور کر لیا۔ میرے دوسرے ساتھی کئی کئی بار اپنے موضوع بدل چکے تھے۔ لیکن میرے لیے موضوع تبدیل کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کیونکہ مخدوم میرا پسندیدہ موضوع تھے۔

مخدوم صاحب کے ماحول سے قریب رہنے اور برسوں تک ان کے جلسوں، مشاعروں اور دوسری ادبی تہذیبی اور سماجی نشستوں میں میں شرکت کے باوجود ان سے مل کر دیر تک بات چیت میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ لیکن اپنے کام کے سلسلے میں ایسا کرنا میرے لیے ضروری تھا۔ مخدوم سے ملنے اور انھیں قریب سے دیکھنے اور ان کے بارے میں بہت سی باتیں جاننے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ مخدوم ایک بڑے شاعر ہی نہیں ہیں ایک بہترین انسان بھی ہیں۔

میں جب پہلی بار مخدوم صاحب سے ملنے کی غرض سے ان کے گھر گیا تو اس وقت میں ان کی شخصیت سے مرعوب تھا اور اپنے آپ کو نروس محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس وقت گھر پر موجود تھے۔ اطلاع ملنے کے کچھ ہی دیر بعد باہر آئے۔ بڑھ کر مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا۔ میں نے مختصر طور پر اپنا تعارف کرایا اور غرض بیان کی۔ سُن کر ہنسنے لگے۔ اور ایسے لب و لہجہ میں گفتگو کی اور اس سادگی اور انکساری سے ملے کہ سارا NERVOUSNESS نروس نس ختم ہوگیا اور میری ہمت بڑھی۔ انھوں نے میری باتیں توجہ سے سنیں۔ مجھے قابل اعتنا سمجھا اور مسکراتے ہوئے جوابات دیئے۔ میں آئندہ تفصیلی ملاقات کے لیے دن اور وقت مقرر کر کے وہاں سے لوٹا۔

میرے بعض ساتھیوں کو جو ایسے ادیبوں اور شاعروں پر مقالے لکھ رہے تھے جو بقید حیات تھے شکایت تھی کہ انھیں اپنے مقالوں کے لیے ان ادیبوں اور شعرا کا مکمل تعاون حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن میں اس سلسلہ میں خوش قسمت تھا کیونکہ مجھے مقالے کی تیاری میں مخدوم صاحب

سے بھرپور تعاون ملا۔ صرف ایک بار اہم مصروفیت کے باعث وہ مقررہ وقت پر مجھے وقت نہ دے سکے۔ دوسری طرف دوبار ایسا بھی اتفاق ہوا کہ خود میں ان سے وقت لے کر ان کے پاس نہ جا سکا۔ فون پر ربط پیدا کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ میرے منتظر ہیں۔ مجبوری بیان کر کے میں نے معذرت چاہی۔

پہلی دفعہ انٹرویو دینے کے لیے مخدوم صاحب نے مجھے صبح آٹھ بجے گھر پر بلایا تھا۔ میں سوا آٹھ بجے ان کے گھر پہنچا۔ پتہ چلا کہ وہ میرا انتظار کر کے پارٹی آفس جا چکے ہیں۔ مجھے شرمندگی اور حیرت ہوئی۔ شرمندگی اس لیے کہ میں مقررہ وقت پر نہیں پہنچ سکا تھا اور حیرت کی وجہ یہ تھی کہ مخدوم ۸ بجے تک ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر باہر جا چکے تھے۔ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ شاعر مخدوم صبح دیر تک سوتے ہوں گے اور ۱۱ یا ۱۲ بجے گھر سے باہر نکلتے ہوں گے میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ اتنے پابند اور اصولی آدمی نکلیں گے، ان کی زندگی میں اتنی باقاعدگی اور اتنا سلیقہ ہوگا۔ میں ان کے گھر سے پارٹی آفس پہنچا۔ گھر پر دیر سے پہنچنے کی معافی چاہی اور دریافت کیا کہ کیا وہ مجھے کچھ وقت دے سکتے ہیں۔ مخدوم تیار ہو گئے اور ہم قریب کے ایک کافی ہاؤس میں بیٹھ گئے۔ اس وقت میرے ساتھ ایک سوال نامہ تھا۔ جس میں مخدوم کے حالات زندگی اور شاعری کے بارے میں بیسیوں سوالات درج تھے۔ تاکہ مخدوم کا بلکہ میرا وقت بھی بچے اور کام میں ربط اور ہم آہنگی رہے۔ مخدوم تقریباً ایک گھنٹہ تک سوالات کے جواب دیتے رہے۔

ایک بار میں مخدوم صاحب کے دیئے گئے وقت پر گھر پہنچا۔ وہ ایک چھوٹی بچی سے بیٹھے ہوئے کھیل رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس بچی کو باغ عامہ

لے جانا ہے وہاں کچھ تصویریں کھنچوانے کے بعد بچّی کو مخدوم صاحب نے نصرت کے ذریعہ گھر روانہ کردیا اور ہم بہت دیر تک باغ عامہ کے ایک گوشہ میں بیٹھے رہے۔ میں سوالات پوچھتا جاتا اور مخدوم صاحب کبھی مختصر اور کبھی تفصیل سے جواب دیتے۔ بعض سوالات کا انھوں نے بہت کھل کر جواب دیا تھا۔ ایک خاص بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ وہ سوالات کی نوعیت اور جوابات دیتے وقت اپنے موڈ کا خاص خیال رکھتے تھے۔ زندگی کے گزرے ہوئے ایام کی یاد تازہ کرتے وقت وہ اپنے سارے وجود کے ساتھ اس ماحول میں پہنچ جانا چاہتے تھے جن سے ان یادوں کا تعلق ہوتا۔

مقالے کے مکمل ہونے تک مخدوم صاحب سے کچھ اور ملاقاتیں رہیں اور جب میرا مقالہ مکمل ہوگیا تو سب سے پہلے خود مخدوم صاحب نے خواہش کی کہ وہ اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔ امتحان گزر گیا۔ احباب کا اصرار تھا کہ مخدوم پر لکھے گئے مقالے کو میں کتابی شکل میں شائع کروں۔ میرا خیال تھا کہ جو مطالعہ میں نے کسی حد تک امتحان کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا ہے اسے فی الفور شائع کر دینے کی بجائے اس شخصیت کا بھرپور مطالعہ کیا جانا چاہیے۔ اس کی زندگی کے مختلف اجزاء جمع کرنے چاہئیں۔ ان کی شاعری اور فکر و فن کا تفصیلی جائزہ لینا چاہیے۔ اس کے بعد کہیں ایک ضخیم کتاب شائع کی جاسکتی ہے۔ لیکن میرے ساتھیوں کا خیال تھا کہ مخدوم پر میں نے جو کام کیا ہے اسے جلد از جلد معمولی ردوبدل کے بعد شائع کردینا چاہیے کیونکہ مخدوم جیسی قدآور شخصیت کی زندگی اور شاعری پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ مخدوم اور ان کی شاعری پر مضامین بھی کم لکھے گئے ہیں۔ مخدوم پر لکھنے والوں

کی سہولت کے لیے کتاب کی شکل میں بہت سا ضروری مواد ان کے سامنے ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس استدلال یا ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے "مخدوم ۔ ایک مطالعہ" کے نام سے کتاب شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ کتاب کی رسم اجرائی کے موقع پر ایک پُر اثر تقریب منعقد ہوئی تھی۔ اس تقریب میں مخدوم کو میں نے بڑے ہی اچھے موڈ میں دیکھا۔ اس تقریب میں انھوں نے اپنے بارے میں جو باتیں کہی تھیں وہ میرے دل پر نقش ہو کر رہ گئی ہیں۔ سب سے پہلے انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ضخامت بتاتے ہوئے کہا کہ وہ تو چاہتے تھے کہ ان پر لکھی جانے والی کتاب بہت زیادہ ضخیم ہو۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں سے جس ضخامت کا اشارہ کیا تھا وہ مولوی عبدالحق کی ڈکشنری کی ضخامت سے کچھ کم نہ تھی جب کہ میری کتاب مقابلتاً بہت ہی پتلی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت اور اس پر متذکرہ بالا تقریب اور دوسرے موقعوں پر کیے گئے تبصروں اور مشوروں سے متاثر ہو کر میں چاہتا تھا کہ "مخدوم ۔ ایک مطالعہ" کو حقیقی معنی میں ایک تفصیلی اور بڑی حد تک مکمل مطالعہ میں تبدیل کروں اور مولوی عبدالحق کی ڈکشنری جیسی ضخامت والی ضخیم اور موٹی کتاب شائع کی جائے جس میں مخدوم کے کلام کا انتخاب اور ان کے بعض اہم خطوط ان کے کہے ہوئے لطیفے اور بہت کچھ ہو۔ بعض قریبی دوستوں سے اس بارے میں گفتگو کی تھی کہ مجھے پھر سے مخدوم صاحب سے ملنا پڑے گا اور ان کی کتاب زندگی کے اوراق جو منتشر ہیں ترتیب وار اور تاریخ وار جمع کرنا ہوں گے۔ ایک نیا مطالعہ شروع کرنا ہوگا۔ لیکن ابھی یہ نیا مطالعہ شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ مخدوم صاحب کے قلب پر اچانک شدید حملے کی منحوس اطلاع ملی اور چند گھنٹے بعد یہ معلوم ہوا کہ مخدوم اب نہیں رہے۔ کسی کے

وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ جو ابھی ہمارے ساتھ تھے کس طرح "نہیں رہے" کہلائے جا سکتے ہیں۔ کاش یہ اطلاع غلط ثابت ہوتی۔ کوئی اس افواہ کی تردید کرتا لیکن یہ ایک حقیقت تھی موت کی طرح اٹل۔

○○

# ترجمہ اور اُس کی اہمیت

حجری دور میں بھی ہر انسان کی کوئی نہ کوئی بولی ہوگی، مختلف گروہوں کی مختلف بولیاں ہوسکتی ہیں، ادائے مطلب کے لیے بولے جانے والے صوتی اشاروں میں اختلاف کے پیدا ہوتے ہی، ترجمہ کی ضرورت محسوس ہوی ہوگی اور "ضرورت تو ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔" اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ترجمہ ابتدائی تہذیب سے ہی انسانی روابط کے ایک اہم ادارے کی حیثیت سے کارفرما ہے اور ترجمے کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کے انسانی تاریخ ہے۔ ترجمے کے فن سے انسانیت نے جو فیض اٹھایا ہے۔ اس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اگر یہ فن نہ ہوتا تو آج ہمارا علم محدود ہوتا اور انسانی تعلقات اتنے گہرے اور وسیع نہ ہوتے۔ ترجمے کے فن نے تاریخ میں جو اہم ترین رول ادا کیا ہے اس کی داستان اتنی طویل ہے کہ اسے ایک مختصر مضمون میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے، تاہم یہ مضمون ترجمے کے کاروبار کے پھیلاؤ، اس کی اہمیت اور اثرات سے متعلق ہے۔ اپنی زبان میں کتابیں تصنیف کرنے کی اہمیت مسلمہ ہے لیکن سابقہ انسانی تجربے کی روشنی میں دیگر زبانوں کے تراجم کی

ضرورت اور افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اگر کوئی صرف "افلاطون" کو ہی جاننے کا دعویٰ کرے تو وہ یقیناً افلاطون کو بھی صحیح معنوں میں نہیں جانتا، اپنے آپ کی پہچان کے لیے بھی دوسروں کو جاننا ضروری ہوتا ہے، تقابلی مطالعہ نئے معیارات اور امکانات کو جنم دیتا ہے، کسی تخلیقی کام کا ترجمہ بھی ایک تخلیقی عمل سے مشابہ ہوتا ہے اور تجربے کے عمل کے قطع نظر اصل تخلیق کے خارجی لباس کی تبدیلی نئی تخلیقات کی محرک بھی ہو سکتی ہے۔ اس اعتبار سے دیگر زبانوں کے ادب کے تراجم خواہ وہ کلاسیکی ادب کے ہوں یا جدید ادب کے غیر معمولی اہم اور مفید ہوتے ہیں، یہ تراجم ادبی افق کو وسیع تر کرتے ہیں اور ایک عالمی و کائناتی تصور پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں تعلیم یافتہ افراد عام طور پر جس غیر ملکی زبان سے واقف ہیں وہ انگریزی ہے۔ اس لیے ہمارا ملک اس مواد ہی سے زیادہ استفادہ کر سکتا ہے۔ جو انگریزی زبان میں موجود ہے۔ دیگر غیر ملکی زبانوں کا ادب ہو کہ جدید علوم کے بارے میں معلومات، ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ انگریزی تراجم ہی کے ذریعہ آسان ہے۔ اگر بازار سے خریدی ہوئی پیٹینٹ ادویات کے ترکیب استعمال کے پرچے انگریزی کی بجائے جرمن زبان یا کسی اور یورپی زبان میں ہوں تو ان ادویات کا بڑے پیمانے پر عام استعمال کیوں کر ممکن ہو سکے گا۔ اسی طرح اگر سائنس، ٹکنالوجی اور خلائی تحقیقات پر سیر حاصل مواد اور دیگر فنی کتابیں روس سے روسی زبان میں ہندوستان بھیجی جائیں تو ان سے وسیع پیمانے پر کس طرح استفادہ کیا جا سکے گا۔ درسی اور فنی کتابوں، ادویات، مشنری آلات و اوزار وغیرہ کے استعمال و استفادہ میں لسانی کی رکاوٹوں کو ترجمہ ہی کے ذریعہ دور کیا جا سکتا ہے۔ سائنس کی ترقی کے سبب آج دنیا

بہت سکڑ گئی ہے۔ جس طرح اقوام اور ممالک آج کے زمانے میں ایک دوسرے کو بہت کچھ دیتے اور لیتے ہیں اسی طرح مختلف زبانوں کا ادب بھی ایک دوسرے کو بہت کچھ دیتا اور حاصل کرتا ہے۔ دیگر زبانوں کے اعلیٰ اور معیاری ادب کو اپنی زبان میں منتقل کرنے سے نہ صرف یہ کہ مختلف قوموں کے رنگا رنگ ادبی خزانوں سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ اس سے ذہن اور کردار کو ایک نئی تربیت کی مسرت بھی حاصل ہوتی ہے۔ یہ تراجم جس زبان کے ادب کا جز بنتے ہیں اس کو اپنے حسن سے مالامال بھی کر دیتے ہیں، جہاں تک اُردو ادب کا تعلق ہے عالمی ادب کے تراجم سے یقیناً اس کا دامن وسیع ہوگا اور اُردو دنیا نئے رجحانات و تحریکات اور جدید افکار واسالیب سے روشناس ہوگی۔ اردو میں فارسی، عربی اور انگریزی کتابوں کے تراجم کثرت سے موجود ہیں، ان کے علاوہ سنسکرت، ہندی اور علاقائی زبانوں کے ترجمے خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ روسی، فرانسیسی، جرمنی اور ترکی زبانوں کی بھی بہت ساری کتابوں کے ترجمے کیے گئے ہیں جو یا تو مختلف اداروں کی کوششوں کا نتیجہ ہیں یا انفرادی کوششوں کا حاصل ہیں، اُردو میں ترجمہ کی رفتار کو تیز کرنا ضروری ہے —— کیونکہ اُردو میں ترجموں کی تعداد دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں بہت کم ہے، اردو میں ہر شعبہ اور موضوع کے معیاری کتب کا ترجمہ ہونا چاہیے۔ علاقائی زبانوں کے معیاری اور نمائندہ تصانیف کا ترجمہ بھی ضروری ہے، قومی یک جہتی کی خاطر اس کی بڑی اہمیت ہے، ہماری زبان میں طبیعیاتی، حیاتیاتی اور سماجی علوم کا سرمایہ زیادہ نہیں ہے اس کے لیے بھی ترجمہ کا سہارا لینا ہوگا، جہاں عربی اور فارسی کی اصطلاحات کے ذریعہ جدید علوم اور سائنسی علوم کا بہتر طور پر ابلاغ ممکن نہیں، عربی اور فارسی کی بجائے انگریزی سے اصطلاحات مستعار لینی ہوں گی یا پھر ایسی اصطلاحات کو

جوں کا توں اپنا لینا چاہیے جو عالمی اصطلاحات بن چکی ہیں۔ یہ اصطلاحات روسی زبان کی بھی ہو سکتی ہیں، جرمن یا کسی دوسری زبانوں کی بھی۔ آج کے برق رفتار زمانے میں مخففات کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہو چکی ہے۔ انگریزی زبان میں نئے الفاظ کے داخلہ کے مقابلہ میں مخففات کے اضافہ کی رفتار حیرت انگیز حد تک تیز ہے آج کی اس دنیا میں سائنس اور ٹکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی کی وجہ سے نئی معلومات میں اضافہ کی رفتار اتنی تیز ہے کہ صدہا سال کی جمع کردہ معلومات کو اگر ایک ترازو کے پلڑے میں رکھا جائے اور دوسرے پلڑے میں گذشتہ چند سال کے عرصہ میں پیدا ہونے والی نئی معلومات کو رکھا جائے تو کوئی عجب نہیں، تازہ معلومات کا پلڑا ہی جھک جائے۔ ادائے مطلب میں کم سے کم اور موزوں ترین الفاظ کا استعمال اور مخففات سے بھرپور استفادہ آج کے دور میں ناگزیر بنتا جا رہا ہے۔ اس طرح ترجمے کا فن آج ایک باقاعدہ اور سائنٹیفک فن بن چکا ہے

سائنسی اور ٹیکنیکل موضوعات پر لکھی گئیں کتابوں کے تراجم کے لیے ضروری ہے کہ مترجم اس علم پر عبور رکھتا ہو جس پر کتاب لکھی گئی ہے۔ ان تراجم میں نظریات اور تصورات کی صحت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے خیال صحت کا تجزیہ ان موضوعات کے ایسے ماہرین سے کروانا ہوگا جو زبان پر بھی قدرت رکھتے ہوں ادبیات کا ترجمہ علمی اور سائنٹیفی موضوعات پر لکھی گئیں کتابوں کے ترجمہ سے زیادہ مشکل ہے اور خصوصاً شاعری کا۔ بعضوں کا تو خیال ہے کہ ایک زبان کی شاعری کا دوسری زبان میں ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا، یہ کہنا بڑی حد تک درست ہے کہ تخلیق کا ہر عمل ایک طرح سے ترجمہ کا عمل ہے۔ کیونکہ آرٹ بجائے خود کسی غیر صوتی تجربہ کو صوتی شکل دینے کی کوشش کا نام ہے۔ ترجمے میں ہم تخلیق کے ایک ثانوی

عمل پر کار بند رہتے ہیں، ترجمے کے عمل میں مترجم کسی ایک زبان کے وجدانی تجربے کی دوسری زبان میں بازآفرینی کی کوشش کرتا ہے۔

ترجمہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں، اس کے لیے بعض ضروری لیاقتیں اور شرائط درکار ہیں مثلاً جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے وہ مترجم کی مادری زبان ہو تو بہتر ہے، مترجم کو ملتے جلتے تجربے اور تخیل کی بازآفرینی کرنی چاہیے۔ محاورے کے لفظی ترجمے کی بجائے ملتے جلتے محاورے کا استعمال کیا جانا چاہیے، چونکہ کسی زبان میں دو لفظ ایسے نہیں ملتے جو مکمل طور پر ایک دوسرے کے مترادف ہوں تو کس طرح ایک لفظ کا بھرپور مترادف دوسری زبان میں مل سکتا ہے۔ اس لیے مترجم کو قریب المعنی الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے۔ کسی انگریزی کی کتاب کے اُردو ترجمے پر جو ترجمے کی تمام ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا گیا ہے، بہتر ہوگا اگر اردو سے واقف کوئی ایسا شخص جس کی مادری زبان انگریزی ہو اور اپنی مادری زبان پر عبور ہو نظر ثانی کرے۔ ایشیا ہی کے ایک ملک جاپان کے ادب کا جائزہ لینے سے ترجمے کی اہمیت اور افادیت کا بھرپور طور پر اندازہ ہوگا۔ جاپان کے ادب کو عالمی ادب کا درجہ حاصل ہے۔ اس ملک کے ادب کو جو بلندی اور عظمت حاصل ہوئی ہے اس کے کئی وجوہ ہیں مگر جاپانی ادب کو ایک خاص سطح سے اوپر لے جانے والا سب سے اہم سبب غیر ملکی کتابوں کا جاپانی زبان میں ترجمہ ہے۔ ان تراجم نے جاپانی زبان کی تخلیقات یا تحریروں کا مزاج بنایا ہے۔ ایک خاص منصوبے کے تحت جن بے شمار کتابوں کا جاپانی زبان میں ترجمہ کیا گیا ہے اس کی مثال پیش کرنا ممکن نہیں، جاپانی عوام کو پڑھنے سے جو لگاؤ اور دلچسپی ہے اور وہاں پر غیر ملکی کتابوں کا جس وسیع پیمانے پر ترجمہ ہوتا ہے اس کے پیش نظر

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں کہیں نہ تو اتنی کتابیں پڑھی جاتی ہیں اور نہ کسی ملک میں اتنی بڑی تعداد میں غیر زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ کیا جاتا ہے، یہ بات ہم بڑی سہولت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عالمی ادب کی تمام اہم کتابوں کا جاپانی زبان میں ترجمہ موجود ہے۔

دوسری طرف ہمارے ملک کی صورت حال یہ ہے کہ انگریزوں کے طویل دورِ حکومت کی وجہ سے ہمارے اہلِ قلم میں برطانوی ادبیات سے ہم آہنگی کرنے کا رجحان پیدا ہوا، ہمارے ملک کے جدید ادب کی آبیاری بڑی حد تک برطانوی سرچشموں سے ہوئی ہے۔ اور جہاں تک غیر برطانوی ادب کے بارے میں ہماری تھوڑی بہت معلومات ہیں وہ انگریزی ترجموں کے وسیلے سے ہے، یہ صورت کچھ اُردو کی ہی نہیں بلکہ ہندی، بنگالی، گجراتی، تلنگی، مرہٹی، تامل، ملیالم اور دوسری سب ہی علاقائی زبانوں کی یہی کیفیت ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمارا ادب جہاں تک کسی رجحان سے مطابقت پیدا کرنے کا سوال ہے بڑی حد تک یک رخہ ہو گیا ہے جب کہ دنیا کی تقریباً تمام اعلیٰ تخلیقات کا جاپانی زبان میں ترجمہ ہونے کی وجہ سے جاپانی ادب عالمی ادب کے دھارے سے مل گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ بہت سے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے انگریزی زبان میں ایسی دستگاہ حاصل کی ہے کہ ان کے ہم عصر جاپانی کبھی ایسی ماہرانہ قدرت کا تصور بھی شائد نہ کرسکیں، ایک لحاظ سے یہ اچھی بات ہے کہ ہم غیر ملکی ادب کو راست طور پر جذب کریں، بہ نسبت اس کے کہ جاپانیوں کی طرح بالواسطہ ایسا کیا جائے لیکن ہندوستانی انگریزی ادب اس وقت تک نہیں پڑھ سکتے، جب تک کہ وہ ایک خاص عمر تک نہ پہنچ جائیں۔ حالانکہ اس عمر تک جاپانی عالمی ادب سے ایسی یگانگت اور واقفیت حاصل کر لیتے ہیں جیسی انہیں اپنے ادب سے ہوتی ہے۔

اس صورت حال کی وجہ سے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ترجمہ کے تعلق سے ہم ایک منصوبہ بند پروگرام پر عمل کریں، یہ پروگرام ایسا ہو جو بامقصدی، تعمیری اور وقت کے تقاضوں کی تکمیل کرنے والا ہو، تمام ممکنہ ذرائع اور وسائل کو منظم طور پر یکجا کرکے مربوط اور ہم آہنگ طریقے پر کام کرنے کی ضرورت ہے، اس سلسلے میں چند سودمند تجاویز مرتب کرکے ان پر عمل کیا جا سکتا ہے، مثلاً ہندوستان میں مترجمین کو باعزت مقام ملنا چاہیے ادبی انجمنوں کی جانب سے نہ صرف تخلیقی کارناموں کو بلکہ اچھے ترجموں کو بھی انعامات دیئے جانے چاہئیں۔ ہماری ریاستی حکومتیں، ترجموں کا کام کروا رہی ہیں لیکن یہ ترجمے ایک ہندوستانی زبان سے دیگر ہندوستانی زبانوں کی حد تک ہی محدود ہیں۔ اس کی بہر حال ایک قوم اور ایک ملک کے تصوّر کو عام کرنے کے لیے بڑی ضرورت ہے۔ لیکن قومی یک جہتی کا کام دراصل قومی ترقی کی بنیاد پر ہونا چاہیے کیونکہ ادب کی ترقی ملک کی ترقی کا ایک اہم جزو ہے۔

ہمارے یہاں چونکہ اسکولوں اور یونیورسٹیوں ہی میں باقاعدہ مطالعہ کا انتظام ہوتا ہے۔ اس لیے ان تعلیمی اداروں میں دوسری زبانوں سے متعلق شعبوں کی تنظیم کو تعلیم، تدریس، تحقیق اور اشاعتی کاموں پر زیادہ سے زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ترجموں اور ترجمے کے فن کو ثانوی تعلیم کی سطح سے لے کر اعلیٰ جامعاتی سطح تک نصاب مطالعہ اور تحقیق میں اہم موضوع کی حیثیت دی جانی چاہیئے۔

سیاسی اور سفارتی سطحوں پر بھی ترجمہ کے کام کو ترقی دینے کے مواقع آج کی دنیا میں بہت کچھ حاصل ہیں، کسی بھی ملک میں غیر ملکی سفارتی دفاتر اس ملک کی زبانوں میں اپنے ملک کے ادب اور کتابوں کے ترجمے کرواتے ہیں، ہر ترقی یافتہ ملک میں بیرونی زبانوں میں اپنے ملک کی کتابوں کے ترجمے اور اپنے ملک کی زبانوں میں بیرونی

ادب کی منتقلی کے کام وسیع و عظیم پیمانے پر جاری ہیں ۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ترجمے سے صرف مفید اور سود مند کام ہی نہیں لیے جاتے ۔ یہ فن خطرناک اور تباہ کن بھی ہے ، ترجمے سیاسی استحصال ، پروپگنڈہ اور سرد جنگ کا ایک موثر ہتھیار بن چکے ہیں اور غیر صحت مند اور منفی اثرات کے حامل بن کر رہ گئے ہیں ۔ اس خطرناک رجحان کی سختی سے مذمت کی جانی چاہیے ترجموں کا مقصد بنیادی طور پر علوم و فنون کی ترقی ایک دوسرے کے ادبی و تہذیبی ورثہ سے واقفیت اور بین الاقوامی امن دوستی اور بھائی چارہ کو فروغ دینا ہی ہونا چاہیے ۔

۵۵

# اقبال اور تصوّرِ وطنیت

اقبال ہندوستان کے ان چند شعراء میں سے ہیں جنہیں عالم گیر شہرت حاصل ہوئی ۔ اقبال کا مقام اردو شاعری ہی میں عظیم نہیں ہے بلکہ ہم عصر دنیا کے بڑے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے ۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت ان کی شاعری کی عظیم خصوصیات کی وجہ سے ہے ان کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کو ایک عظیم نصب العین ، فلسفۂ حیات اور پیام کی اشاعت کا ذریعہ بنایا ۔ ان کا مقصد نوعِ انسانی کو ایک اعلیٰ اور بلند مقام تک پہنچانا تھا وہ چاہتے تھے کہ ان کی شاعری کا مطالعہ کر کے نئی نسلیں اپنی اہمیت کو سمجھیں اور ان میں یہ خواہش پیدا ہو کہ وہ معمولی انسان بنے رہنے کے بجائے عظیم انسان بنیں ۔ پھر وہ یہ چاہتے تھے کہ ایسے عظیم انسان دنیا میں ایک ایسا انقلاب لائیں جس سے ہر شخص میں عظمت اور بلندی تک پہنچنے کا شوق پیدا ہو ۔

حرکت اور عمل اقبال کے فلسفہ اور پیام کی بنیاد ہے انھوں نے اپنی شاعری میں فرد جماعت اور زندگی کے اہم اور بنیادی مسائل پر حکیمانہ اظہار

خیال کیا ہے۔ اقبال اُردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے انسان کو بہت اونچا اور بلند مرتبہ عطا کیا۔ وہ احترام آدمی کو اصل تہذیب سمجھتے ہیں اور مقام آدمی سے سب کو باخبر اور آگاہ کرتے ہیں

آدمیت احترام آدمی　　　باخبر شو از مقام آدمی

اقبال نے مشرق اور مغرب کے علم کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی فکر گہری اور فلسفیانہ ان کا تخیل بلند اور جذبہ طاقت ور تھا۔ اقبال نے اپنے پیام کی اشاعت کے لیے تقریباً (۴۰) سال تک شاعری کی۔ اُردو اور فارسی میں ان کی شاعری کے (۱۰) مجموعے شائع ہوئے۔ اپنی تمام شاعری میں اقبال کہیں بھی اپنے مقصد سے غافل نظر نہیں آتے۔ اقبال نے جب شاعری کا آغاز کیا اس وقت بھی اُردو شاعری کا مقام میر اور غالب کی عظمت اور دوسرے اساتذہ کے شعری سرمایہ اور حالی اور اکبر کے نئے تجربوں کی بدولت کافی اونچا اور بلند تھا۔ لیکن اقبال نے اپنی شاعری سے اردو شاعری کو ہمہ گیری وسعت اور نئی بلندیاں عطا کیں۔

اس مضمون میں اقبال کی ایسی شاعری پیش نظر ہے جو وطن اور اس کے مسائل سے شاعر کی محبت اور دل چسپی کو ظاہر کرتی ہے۔ اقبال نے حب الوطنی کے ایسے ترانے گائے ہیں جو میٹھے دل کش اور حسین ہونے کے ساتھ ہی ساتھ تاثیر میں آپ اپنی مثال ہیں۔ اقبال نے ان نغموں سے اپنے ہم وطنوں کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبہ کو طاقت ور بنانے کی کوشش کی۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

اقبال کا یہ ترانہ ہندوستان کے قومی ترانوں میں منفرد مقام رکھتا ہے اور آج بھی ملک کی فضاؤں میں گونجتا رہتا ہے۔ اقبال کی نظمیں ہمالہ، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت، نیا شوالہ، تصویر درد، رام اور نانک جذبہ حب الوطنی سے لبریز ہیں اور دردمند دل کی آواز ہیں۔ ان نظموں میں وطن سے سچی اور گہری محبت کے اظہار کے ساتھ ہی ساتھ وطن کی زبوں حالی پر نوحہ خوانی بھی ہے وہ اپنے اہل وطن کو ایک دوسرے سے محبت کرنے اور غلامی کا جوا اتار پھینکنے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ اقبال کی اردو شاعری کا پہلا مجموعہ "بانگ درا" وطن سے محبت کی شاعری کا ایک خوب صورت مرقع ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اقبال نے چند سال تک ہی حب الوطنی کے نغمے گائے اور وطن سے محبت کا جذبہ صرف "بانگ درا" ہی میں نظر آتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اقبال کے ہاں یہ جذبہ آخر تک ملتا ہے۔ ضرب کلیم (۱۹۳۶ء) اور جاوید نامہ (۱۹۳۲ء) کی شاعری اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے۔

اقبال ضرب کلیم کی ایک نظم "شعاع امید" میں ایک شوخ کرن کے ذریعہ نہ صرف مشرق بلکہ ارض ہند سے اپنی دلی وابستگی، محبت اور دردمندی کا اظہار ان اشعار میں کرتے ہیں۔ شوخ کرن کہتی ہے۔

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو<br>
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب<br>
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز<br>
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

چشمِ مہ و پروین ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کے لیے ہر بحرِ پُرآشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانہ کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

اُردو شاعری میں ایسے اشعار کی مثال مشکل سے ملے گی جن میں شاعر وطن پرستی کے جذبات سے اس درجہ سرشار ہو اور اس کی دردمندی کا یہ عالم ہو۔ جاوید نامہ میں جو اقبال کی شاعری کے آخری دور کی نمائندگی کرتا ہے اقبال سیرِ افلاک کے دوران میں بھی اپنے وطن کو نہیں بھولتے، وطن کی محبت کے ساتھ ہی وطن کو آزاد دیکھنے کی تڑپ بھی ملتی ہے۔ وطن کی زبوں حالی پر ان کا قلم روتا ہے۔ یہ سیر اقبال مولانا روم کی ہمراہی میں کرتے ہیں جہاں وہ ہندوستان کی عظیم شخصیتوں مہاتما بدھ اور بھرتری ہری سے ملتے ہیں۔ ہندوستان کی یہ عظیم شخصیتیں دنیا اور زندگی کے بارے میں اہم نکتے اقبال کے گوش گذار کرتی ہیں اور جب اقبال بھرتری ہری سے اپنے ہم وطنوں ... کی حالت اور بے چینی کے بارے میں استفسار کرتے ہیں تو بھرتری ہری اس کے اسباب و علل

پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اسی سیر کے دوران فلک زحل پر اقبال کو ان دو غداران وطن کی روحیں نظر آتی ہیں جنھوں نے ملک و ملت سے بے وفائی کی اور ملک میں غلامی کا بیج بویا وہ ہیں۔

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگ آدم ننگِ دیں، ننگ وطن

ان کی ارواح کو سخت اذیت و عذاب میں مبتلا دکھانے کے بعد روح ہندوستان کو آسمان سے نمودار ہوتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

آسماں شق گشت و حورے پاک زاد
پردہ را از چہرۂ خود بر کشاد
در جبینش نار و نور لا یزال
در دو چشم او سرور لا یزال
حلۂ در بر سبک تر از سحاب
تار و پودش از رگِ برگ گلاب
با چنیں خوبی نصیبش طوق و بند
بر لب او نالہ ہائے دردمند
گفت رومی روح ہند است این نگر
از فغانش سوزہا اندر جگر

اس منظر میں اقبال نے ہندوستان کی جو خوب صورت اور نادر تصویر پیش کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں اپنے وطن سے انہیں بھرپور محبت اور

وابستگی ہے وطن کی غلامی کے خیال سے وہ بے حد دکھی اور رنجیدہ بھی ہیں۔ روح ہندوستان اقبال سے نالہ و فریاد کرتی ہے کہ وہ آزادی کی روشنی سے محروم ہے اور غلامی کی تاریکی اس کا مقدر ہے۔ میر جعفر جیسے غدارانِ وطن ابھی ملک میں موجود ہیں ایسی ملعون روحوں سے روح ہندوستان پناہ مانگتی ہے۔

وطن سے غداری کرنے پر جو ذلت اور رسوائی ہوتی ہے اور غدار کا جو عبرت ناک اور شرم ناک انجام ہوتا ہے اس کا نقشہ اقبال بڑے موثر انداز میں کھینچتے ہیں۔ غدارانِ وطن میر جعفر اور میر صادق کی روحوں کو کہیں ٹھکانہ نہیں ملتا۔ انھیں کوئی قبول کرنے تیار نہیں۔ حتیٰ کہ جہنم کی آگ نے بھی یہ کہہ کر ان روحوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ ان سے خس و خاشاک بہتر ہے اور جہنم کی آگ ان ملعون روحوں سے زیادہ پاک ہے۔ جاوید نامہ میں بیان کی ہوئی یہ باتیں کیا یہ ثابت نہیں کرتیں کہ اقبال سچے وطن پرست ہی نہیں تھے بلکہ وطن کے غداروں کو بھی معاف نہیں کر سکتے تھے۔

اقبال کی شاعری میں آزادی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ آزادی کے لیے احساس اور جذبہ کی شدت، تڑپ اور بے قراری ان کے اشعار میں جگہ جگہ ملتی ہے وہ غلامی کی زندگی کو برائیوں کی جڑ سمجھتے ہیں اور اسے ہر طرح سے ہدفِ ملامت بناتے ہیں انہیں اپنے ہم وطنوں سے غلام بنے رہنے پر شکایت ہے۔ ضربِ کلیم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

اس بحث میں جو بات وضاحت طلب رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وطن سے محبت اور آزادیٔ وطن کے لیے شدید خواہش، امنگ اور سچی تڑپ کے باوجود وطنیت اور قومیت کے بارے میں ان کے تصورات میں جو تبدیلیاں آئیں وہ کیا تھیں، کس نوعیت کی تھیں۔ اقبال کی شاعری کے گہرے مطالعہ کی روشنی میں ان تبدیلیوں کو ذہنی ارتقار کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ یہ تبدیلی جذبہ کی تبدیلی نہیں بلکہ معنی و مفہوم کی وسعت تھی۔ انھوں نے وطن کی محبت کو ترک نہیں کیا۔ وطن پرستی سے ایک دنیا اور آفاقیت کی طرف ان کی فکر نے جست لگائی۔ اس تبدیلی کو سمجھنے کے لیے ہمارے ذہن میں یہ بات رہنی چاہیے کہ اقبال کی معاصر دنیا میں قومیت اور وطنیت کے تصورات میں نہیں معنی و مفہوم میں نئی وسعتیں ابھر رہی تھیں۔ وہ دن گذر چکے تھے جب قومی وحدت اور انسانوں میں اتحاد کے لیے وطن کو ایک بنیاد سمجھا جاتا تھا۔ اقبال کے عہد میں اس تصوّر اور خیال میں تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ عالم گیر انسانیت کا تصور عام ہو رہا تھا۔ مفکرین نے خیال کی یک جہتی اور مخصوص نظام حیات پر ایقان کو سماجی اتحاد کی بنیاد بنایا۔ مارکس نے پرولتاری آمریت کے بعد غیر طبقاتی اور بغیر مملکت کے سماج کا تصور پیش کیا اور اسی تصور کو آگے بڑھاتے ہوئے لینن نے بین الاقوامی اشتراک کا نظریہ پیش کیا۔ گاندھی جی بھی مملکت کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ ٹیگور قومیت کے تنگ دائرہ کے خلاف تھے اور بین الاقوامی قومیت میں یقین رکھتے تھے۔ ٹیگور نے ۱۹۲۰ء میں جب وہ امریکہ گئے ہوئے تھے اپنے ایک لکچر میں کہا تھا:

"مجھے ہندوستان سے محبت ہے میری مراد ہندوستان سے اس کے

در و دیوار نہیں بلکہ اس کا نصب العین ہے۔ اس خیال کے
تحت اگر لوگ مجھے محب وطن نہ گردانیں نہ سہی لیکن میں دنیا
کے ہر گوشہ میں ایسے ہموطنوں کی تلاش میں رہوں گا۔"

اقبال کے ہاں قومیت کا جو تصور ہے وہ ایک Ideal ہے اپنے اس تصور کی تشکیل میں اقبال قرآن سے استفادہ کرتے ہیں اور خدا انسان اور حیات و کائنات کی وحدت کو جب اپنے تصورِ زمان و مکان کے آئینہ میں پیش کرتے ہیں تو اس عظیم تر تصور میں کسی قسم کی نسلی جغرافیائی اور قومی تقسیم کا امکان باقی نہیں رہتا۔ اس تصور توحید کو وہ انسان کے لیے تکمیل ذات کی حقیقی دنیا تصور کرتے ہیں اور اسے بنی نوع انسان کا وطن قرار دیتے ہیں۔

OO

# ڈاکٹر زور اور اُن کے تحقیقی کارنامے

اُردو کے معمار اور اُردو تحریک کے رہنما کی حیثیت سے ساری دنیا ڈاکٹر زور سے اچھی طرح واقف ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ جدید حیدرآباد کی تعمیر و تشکیل اور ملک کے اس خطہ میں علوم و فنون کی ترقی ادبی علمی تحقیقی اور اشاعتی سرگرمیوں کے فروغ غرض یہ کہ ایک منفرد اور مثالی ملی جلی تہذیب کو پروان چڑھانے میں جن لوگوں نے اہم حصّہ لیا ان میں ڈاکٹر زور کی شخصیت بڑی نمایاں ہے۔ یوں تو ڈاکٹر زور کی خدمات علمی ادبی اور تہذیبی شعبوں میں بظاہر مرکوز نظر آتی ہیں لیکن اُس کے اثرات اور نتائج بڑے دُور رس اور ہمہ گیر ثابت ہوئے اور مستقبل میں بھی ان کی خدمات کو اور واضح اہمیت حاصل ہوگی اور اسی کو بنیاد بنا کر ادب کے قافلے آگے بڑھیں گے۔

ڈاکٹر زور کی شخصیت کی اہم اور بنیادی خصوصیت محنت اور عزم و حوصلہ ہیں۔ ان ہی بنیادی خصوصیات نے محی الدین قادری زور کو ڈاکٹر زور بنایا، کامیابیوں سے ہم کنار کیا اور ایسے کارناموں کا حوصلہ دیا جن پر حیرانی ہوتی ہے۔

کوئی فرد ہو کہ معاشرہ یا کوئی قوم ہو اس کی ترقی، خوش حالی اور روشن مستقبل کا دار و مدار پر خلوص اور مسلسل سعی و کاوش پر ہوا کرتا ہے اس کے لیے سخت محنت کا عادی ہونا پڑتا ہے۔ جستجو و عمل پر ایمان رکھنا پڑتا ہے اس کی ایک اچھی مثال ڈاکٹر زور کی زندگی ہے ممکن ہے کہ بظاہر یہ بات رسمی و روایتی معلوم ہو لیکن یہی وہ حقیقت اور راز ہے جس کے ذریعہ افراد ہی نہیں معاشرے اور تہذیبیں بھی بام عروج پر پہنچنے کا اعزاز حاصل کرتی ہیں۔

بے محنتِ پیہم نہیں کھلتا کوئی جوہر
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

ڈاکٹر زور کی متعدد تصانیف، ادارۂ ادبیات اُردو اور ایوان اُردو کی عمارت کو دیکھ کر ان کی اہمیت اور ڈاکٹر زور کی محنت کا اندازہ نہ کرنا اور بات ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ انھیں اپنے کاموں کی انجام دہی میں بڑے ناسازگار اور نامساعد حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ بسا اوقات سخت جدوجہد کے باوجود انھیں خاطر خواہ امداد اور تعاون حاصل نہ ہو سکا۔ لیکن اس کے باوجود وہ مایوس اور ناامید نہیں ہوئے۔ حوصلہ شکن ماحول اور حالات میں بھی انھوں نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ یہ ان کا حوصلہ اور عزم ہی تھا جس نے انھیں کامیابیوں کی منزل تک پہنچایا۔ ان کے تمام کام اور کارنامے محنت، عزم اور حوصلہ کا درس دیتے ہیں۔

ڈاکٹر زور کی شخصیت بلاشبہ غیر معمولی صلاحیتوں کی حامل تھی وہ اپنے دوست احباب، ساتھیوں، شاگردوں حتیٰ کہ سرسری طور پر ملنے جلنے والوں کو بھی ہمیشہ دعوتِ عمل دیتے اور بے عمل اور کاہل لوگوں سے ناراض رہتے اور انھیں سخت سُست سناتے۔

ڈاکٹر زور کا یہ احسان ہے کہ انھوں نے حیدرآباد میں نئے لکھنے والوں کا ایک بڑا گروہ بلکہ کارواں تیار کیا اور ہمیشہ خود ہی سربراہ اور میر کارواں کی حیثیت سے آگے آگے رہے وہ اپنے شاگردوں کو لکھنے کی ہمیشہ ترغیب دیتے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے۔ ان کے جن شاگردوں اور تربیت یافتہ ادیبوں نے ان کی شخصیت اور کارناموں کو خراج تحسین ادا کیا ان مضامین میں ہر ایک نے ڈاکٹر زور کے مشفقانہ رویہ اور حوصلہ افزائی کا ضرور ذکر کیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ڈاکٹر زور کی انتھک اور مخلصانہ کوششوں کی وجہ سے حیدرآباد سے ابھرنے والے ادیبوں میں ذوق عمل اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوا اور وہ ادیب اور شاعر جو اچھی اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے بہت جلد اپنے علمی اور ادبی کاموں کے باعث سارے ملک میں جانے پہچانے جانے لگے اور انھیں ناموری اور شہرت حاصل کرنے میں دیر نہیں لگی۔

ڈاکٹر زور نے بیسیوں کتابیں تصنیف کیں اور سینکڑوں مضامین لکھے اور کثیر تعداد میں ادیبوں اور شاعروں اور علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کی تربیت کی اور ان سے لکھوایا۔ ڈاکٹر صاحب کا اہم اور پسندیدہ موضوع جس پر خود انھوں نے کام کیا اور کروایا دکنی زبان اور ادب اور دکنی تہذیب تھا۔ دکنی زبان و ادب اور دکنی تہذیب پر کام کرنے کے لیے ڈاکٹر زور نے جو بڑی اور باضابطہ تحریک چلائی۔ اس کی وجہ دکنی زبان و ادب اور دکنی تہذیب سے ڈاکٹر زور کی محبت تھی۔ سرزمین دکن کے ذرہ ذرہ سے انھیں عشق تھا۔ لیکن اس کے علاوہ یہ تحریک ڈاکٹر زور کی ایک شعوری کوشش بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ تحریک ان مخصوص حالات کے خلاف ایک رد عمل کی حیثیت رکھتی تھی۔ جن میں ڈاکٹر زور کی نسل پروان چڑھ رہی تھی۔ یوں تو اس زمانے میں ان حالات کے خلاف

پھر دکنی کے یہاں ذہنی ردعمل موجود تھا۔ لیکن ڈاکٹر زور نے اس ردعمل کو ایک باضابطہ تحریک کی شکل دی۔

۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب نے گولکنڈہ فتح کیا اور قطب شاہی سلطنت کو مغلیہ سلطنت میں ضم کرلیا گیا اسے دکنی زبان و ادب اور دکنی تہذیب کے زوال کا نقطۂ آغاز سمجھنا چاہیے۔ قطب شاہی سلطنت کے خاتمہ کے بعد اورنگ آباد مغلوں کے صوبۂ دکن کا دارالخلافہ رہا اور جب تقریباً سوا سو برس بعد ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ یہ دارالخلافہ اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل ہوا۔ آصف جاہی سلطنت کی سائز گھٹ گئی تھی اور جنوب کے تمام مغل امرا یہاں سمٹ کر آگئے تھے۔ سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اہل لکھنؤ اور دلی والوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ خاص کر سالار جنگ اول کی ایما پر شمالی ہند کے پڑھے لکھے اور باصلاحیت افراد کی ایک بڑی تعداد حیدرآباد آئی۔ حیدرآباد کا یہ دور مغل برطانوی دور کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ مغلوں نے دکن میں فارسی زبان رائج کی جسے آصف جاہی دور میں بھی جاری رکھا گیا۔ دکنی زبان کی سرپرستی ختم ہوچکی تھی اور اس کا ارتقاء رُک گیا تھا۔ لیکن یہی زبان شمالی ہند میں ارتقاء پذیر ہو کر اردو کہلائی۔ ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ جب اُردو کو فارسی کی بجائے دفتری زبان قرار دیا گیا تو دفتری نظم و نسق بڑی حد تک نوواردانِ دلی و لکھنؤ کے ہاتھوں میں منتقل ہوگیا۔ ان سیاسی حالات اور تبدیلیوں نے مقامی لوگوں میں جنھیں اب تک بھی ملکی باشندے کہا جاتا ہے احساس کمتری کا جذبہ پیدا کیا اور ان پر نااہلی کا لیبل لگایا گیا لیکن جامعہ عثمانیہ کے قیام نے اس صورت حال کو بدل دیا۔ جامعہ کے قابل

اور ہونہار سپوتوں نے احساس کمتری کو ختم کرنے اور خود اعتمادی کے جذبہ کو بیدار کرنے میں کامیابی حاصل کی اس تحریک اور مہم کے امام ڈاکٹر زور تھے۔ دکنی زبان اور ادب کی بازیافت کے ذریعہ وہ نہ صرف یہ کہ اردو زبان اور ادب کے آغاز و ارتقاء کے سلسلہ کی گم شدہ کڑیوں کو جوڑنا چاہتے تھے۔ بلکہ یہ بھی دکھانا چاہتے تھے کہ اردو کے آغاز و ارتقاء میں دکنیوں کا کتنا بڑا اور اہم رول ہے ساتھ ہی ساتھ اہل دکن پر لگائے گئے نااہلی کے لیبل کو نکالنے اور انھیں اہل اور باکمال ثابت کرنے کے لیے خود انھوں نے کتنی ہی کتابیں تصنیف کر ڈالیں اور نئی پود کو تربیت دے کر اس سے بھی کثیر تعداد میں کتابیں تصنیف کروائیں اور بکثرت مضامین لکھوائے۔

ڈاکٹر زور انشا پرداز۔ تنقید نگار۔ شاعر۔ افسانہ نگار اور ماہر لسانیات ہونے کے علاوہ ادبی و تہذیبی مورخ اور محقق بھی تھے۔ ایک مختصر مضمون میں ان کے تمام ادبی کارناموں کا جائزہ لینا اور علحدہ علحدہ میدانوں میں ان کے مقام کا تعین کرنا ممکن نہیں ہے اسی لیے اس مضمون کو ان کے تحقیقی کارناموں کے جائزہ کی حد تک محدود رکھا گیا ہے۔ "کلیات محمد قلی قطب شاہ" "میر محمد مومن" "اردو شہ پارے" "داستان ادب حیدرآباد" "دکنی ادب کی تاریخ" اور "تذکرہ مخطوطات ادارۂ ادبیات اردو" ڈاکٹر زور کے اہم تحقیقی کارنامے ہیں۔ ان میں سے چند تصانیف کی اہمیت واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر زور کی تحقیق کے بارے میں چند باتیں عرض کروں گا۔

"کلیات محمد قلی قطب شاہ" تحقیق کے میدان میں ڈاکٹر زور کا

سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس ضخیم دیوان کی ترتیب برسوں کی محنت اور عرق ریزی کے بعد ممکن ہو سکی۔ اس میں ڈاکٹر زور نے جو مفصل اور مبسوط مقدمہ سپرد قلم کیا ہے وہ محمد قلی قطب شاہ کی سوانح اور اس کی شاعری کی خصوصیات کا احاطہ کرتا ہے۔ محمد قلی کی سوانح اور شاعری کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنے کی غرض سے دکنی تہذیب کے پس منظر کو بھی ابھارنے کی انھوں نے پوری پوری کوشش کی۔ یہ مقدمہ ڈاکٹر زور کے بلند پایہ سوانح نگار اور ادبی مورخ ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔

اس تحقیقی کارنامہ کے منظر عام پر آنے کی وجہ سے اُردو زبان اور ادب کے بارے میں جو بعض غلط مفروضات اور نظریات عام تھے یکسر رد کر دیئے گئے اور محمد قلی کی شاعری نے اُردو شاعری پر عائد کیے جانے والے اکثر اعتراضات اور الزامات کا جواب بھی دے دیا۔ محمد قلی کی شاعری کو اردو دنیا سے روشناس کروا کے ڈاکٹر زور نے تاریخ اردو ادب کو ماضی میں نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا۔ اور نئی عظمت اور ہمہ گیری بخشی۔

ڈاکٹر زور نے اپنے مقدمہ میں گولکنڈہ کی تہذیب و تمدن کی جو تصویر پیش کی ہے وہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب، رواداری، قومی یک جہتی اور باہمی یگانگت کی ایک روشن مثال ہے۔ گولکنڈہ کی یہ تہذیب ملک کے دیگر حصوں کی تہذیب کے مقابلے میں زیادہ "ہندوستانی" زیادہ حقیقی اور تصنع اور تکلف سے مبرّا تھی۔ ڈاکٹر زور اگر کلیات محمد قلی قطب شاہ کو مرتب کرنے کے علاوہ کوئی اور کام نہ بھی کرتے تب بھی اس تحقیقی کارنامہ کی بنا پران کا نام اُردو دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہتا۔

"میر محمد مومن" تحقیق ہی کے باب میں ڈاکٹر زور کی ایک اہم تالیف ہے جو قطب شاہی دور کی ایک نہایت اہم سیاسی اور سماجی شخصیت کی حیات اور کارناموں پر مشتمل ہے ۔ اس کتاب میں ڈاکٹر زور نے تمام اہم اور ضروری ماخذوں سے استفادہ کیا ہے جس میں نایاب و کمیاب مخطوطات، مطبوعات، دستاویزی شہادتیں اور آثار قدیمہ کے ماخذ شامل ہیں ۔ میر محمد مومن کے پسماندگان کے یہاں محفوظ کاغذات اور سواد کا بھی ڈاکٹر زور نے مطالعہ کیا۔ شہر کے اطراف واکناف اور جہاں جہاں سے بھی مواد فراہم ہو سکتا تھا پہنچ کر بڑی ہی تگ ودو، دوڑ دھوپ اور چھان بین کے ذریعہ مواد حاصل کیا۔ میر محمد مومن کی تعمیر کروائی ہوی عمارتیں مسجدیں، تالاب اور دیہات دیکھے ۔ اس کے علاوہ روایات اور قصوں کے بیان سے کتاب میں وہ فضاء پیدا کرنے کی کوشش کی جو تہذیبی تاریخ کو ترتیب دینے کے لیے ضروری ہوا کرتی ہے ۔ معاصر اور قدیم ماخذوں سے ضروری معلومات اور مواد فراہم نہ ہونے کی صورت میں ہی ڈاکٹر زور نے بعد کے ماخذوں later sources سے استفادہ کیا۔

اس کتاب میں میر محمد مومن کے پسماندگان کے بارے میں تفصیلی معلومات دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ میر محمد مومن کے آبا و اجداد، ان کے خاندانی حالات اور ان کے وطن ایران میں ان کے ابتدائی حالات زندگی بھی تفصیل سے لکھا جانا چاہیے تھا۔ لیکن یوں لگتا ہے کہ ڈاکٹر زور گولکنڈے کی سیاسی اور سماجی زندگی میں میر محمد مومن کے رول اور Contribution کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرنا چاہتے تھے۔

سوانح نگاری کے فن اور جدید اصولوں کی روشنی میں اگر ہم اس

کتاب کو جانچنا چاہیں تو قدرے مایوسی ہو گی کیونکہ میر محمد مومن کی زندگی اور شخصیت کے بعض گوشے تاریکی میں ہی رہے۔ اس کے علاوہ ان کے کارناموں کے بارے میں بھی تفصیلی معلومات فراہم نہیں ہو سکیں لیکن یہ کتاب کی کوئی خامی اور نقص نہیں ہے۔ فصل زمانی کے باعث وہ تمام مواد فراہم نہیں تھا جو سوانح اور کارنامون پر مفصل کتاب لکھنے کے لیے ضروری تھا۔ یہ کتاب بلاشبہ گولکنڈہ اور اس کی تہذیب کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور یہی مولف کا مقصد تھا۔

تذکرہ اُردو مخطوطات ادارہ ادبیات اردو جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے ڈاکٹر زور کا ایک اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں اردو مخطوطات کا تذکرہ یا توضیحی فہرست کسی ادارے اور لائبریری میں مطبوعہ یا غیر مطبوعہ شکل میں موجود نہیں ہے۔ ادارۂ ادبیات اُردو اور ادارہ میں لائبریری کے قیام کے بعد ڈاکٹر زور نے نادر اور اہم مخطوطات اکھٹا کرنے کی مہم شروع کی اور جب ادارہ کی لائبریری میں قلمی نسخوں کی تعداد ۵۰۰ سے تجاوز کر گئی تو ڈاکٹر زور کو ان نسخوں کا تذکرہ مرتب کروانے کا خیال پیدا ہوا۔ ڈاکٹر زور اپنی سرکاری و دیگر علمی و ادبی مصروفیتوں کے باعث یہ کام اپنے احباب جناب غلام رسول اور پروفیسر سروری سے کروانا چاہتے تھے جنھیں وہ اس کام کے لیے موزوں اشخاص تصور کرتے تھے۔ لیکن جب یہ حضرات بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر اس پراجکٹ کے لیے وقت نہ دے سکے تو ڈاکٹر زور نے خود اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور سچ تو یہ ہے کہ اس کام کے لیے ڈاکٹر زور ہی نہایت موزوں شخص تھے۔ طالب علمی ہی کے دور سے وہ اپنا بیشتر وقت لائبریریوں میں قدیم مخطوطات کے مطالعہ میں گذارا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے انہیں قدیم دکنی مخطوطات کو پڑھنے میں بڑی مہارت حاصل ہو گئی تھی۔

جامعہ عثمانیہ سے فارغ التحصیل ہو کر ڈاکٹر زور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے یورپ گئے اور یورپ کے دوران قیام میں انھیں جتنے بھی قدیم اُردو مخطوطات دستیاب ہو سکتے تھے ان سب کا غائر مطالعہ کیا۔ قدیم مخطوطات کو پڑھنے کی مہارت مخطوطات کا وسیع مطالعہ اور وسیع معلومات ہی کی وجہ سے ڈاکٹر زور اتنا مشکل اور دقت طلب کام بہتر طور پر انجام دینے کے قابل ہو سکے۔

اگر کوئی مخطوطہ زشت خط میں ہو یا ناقص الاول یا ناقص الآخر ہو یا پھر اس کا سنِ کتابت یا سنِ تصنیف دستیاب نہ ہوتا ہو تو تذکرہ نویس کو گم شدہ کڑیوں کو ملانے کے لیے انتہائی صبر آزما اور انتہائی دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑتا ہے پہلے تو یہ کوشش کی جاتی ہے کہ اندرونی شہادتوں سے کام نکالا جائے اگر اندرونی شہادتیں ناپید یا ناکافی ہوں تو دیگر ماخذوں اور مطبوعات کی مدد سے اس مخطوطے کے بارے میں چھان بین ضروری ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے دیگر اداروں اور لائبریریوں کے تذکروں کی مدد سے یا خود مرتب کو اپنی معلومات کی روشنی میں بھی آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تذکرہ مخطوطات کی ترتیب کس قدر دشوار ہے اور اس کے لیے کتنی ریاضت اور جاں سوزی درکار ہے اس اعتبار سے تذکرہ مخطوطات ادارہ ادبیات بجائے خود ایک ایسا تحقیقی کارنامہ ہے جس کی بنا پر ڈاکٹر زور کا نام تحقیق کے میدان میں ہمیشہ اہمیت کا حامل رہیگا

ڈاکٹر زور نے دکن کی ادبی تاریخ یا تہذیبی تاریخ کے بارے میں جو کچھ بھی قلم بند کیا ہے وہ اصول تحقیق کے اعتبار سے ایک مخصوص انفرادیت کا حامل ہے بعض نزاعی مسائل کے قطع نظر ان کی تحقیق کی بنیاد عام طور پر مضبوط کہی جا سکتی ہے انکی تحقیق کے ماخذ معتبر اور استدلال قوی ہیں۔ یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ ادبی و تہذیبی تاریخ نویسی میں تحریری

شہادتوں کو جتنی اہمیت حاصل ہے رسوم ورواج زبانی روایتوں اور حکایتوں کو کچھ کم اہمیت حاصل نہیں۔ مسز لنٹن Mrs. Lynton اور موہنی راجن کی کتاب The days of the beloved۔ حال ہی میں امریکہ سے شائع ہوی ہے جو نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے دور کی تاریخ ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ماخذ تحریری سے زیادہ تقریری ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کتاب میں لوگوں کی زبانی و تقریری شہادتوں، ان کی بیان کی ہوئی باتوں حتی کہ قصے کہانیوں اور افواہوں کو تک اہمیت دی گئی ہے۔ اس خصوصیت کی بنا پر اس کتاب کے کافی چرچے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ مسز لنٹن اور موہنی راجن نے جو روایات قلمبند کی ہیں اس میں کچھ زیادہ تاخیر نہیں ہوی تاہم یہ روایات بھی کوئی معاصر روایات نہیں۔ قطب شاہی دور کی روایات کو محفوظ کرنے کا کام بڑی محنت سے ڈاکٹر زور نے انجام دیا۔ انھوں نے معتبر اور مستند ماخذوں سے اخذ کردہ مواد کو اکٹھا کی ہوی روایات سے جوڑنے اور ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور اس طرح انھوں نے تحقیق اور روایت کی آمیزش سے ایک ایسا تحقیقی ادب پیش کیا جس سے ایک محقق سے لے کر عام آدمی تک اپنی بضاعت کے مطابق بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر زور نے اپنی تحقیق میں داستان کو داستان اور افسانہ کو افسانہ کہا ہے اور داستان اور افسانہ کو کبھی تحریری شہادت کا نام نہیں دیا۔ داستان ادب حیدرآباد کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں۔

"اس کتاب کے مطالعہ کے وقت یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ یہ کوئی مبسوط تاریخ یا تذکرہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسا جائزہ ہے جو زیادہ تر

مؤلف کے تاثرات پر مشتمل ہے اور جس میں پہلی بار اُردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے نہ صرف شاعروں بلکہ ہر موضوع کے نثر نگاروں کی نسبت بھی ضروری معلومات یک جا کر دی گئی ہیں۔ یہ جن دس ابواب پر مشتمل ہے ان میں سے ہر ایک اتنی وسعت اور اہمیت رکھتا ہے کہ اس پر علیحدہ اور مبسوط کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اگر مستقبل کے ادیب اس کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوں تو سمجھنا چاہیے کہ یہ داستان اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔"

دکنی تہذیب کی بازیافت کے لیے ڈاکٹر زور نے جو کچھ کوششیں کی ہیں ان پر اگر اعتراض کیا جائے کہ وہ مستند اور معتبر تحقیق پر مبنی نہیں ہیں تو اس اعتراض کو زیادہ وزنی نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ ڈاکٹر زور نے جن روایتوں اور حکایتوں کو محفوظ کیا وہ تاریخی طور پر کتنی ہی غیر حقیقی کیوں نہ سمجھی جائیں۔ کیا یہ خود ایک تاریخی حقیقت نہیں کہ یہ داستانیں ایک خاص دکنی تہذیب کے خمیر سے ہی ابھری ہیں اور صدیوں اس میں گشت کرتی رہی ہیں۔ ان دیرینہ داستانوں نے دکنی تہذیب کے ماحول سے اتنے عناصر اور ایسا رنگ و روغن حاصل کیا کہ دکنی تہذیب کے ماخذ میں انھیں بڑی اہمیت حاصل ہو گئی۔ روایت کے مزاج اور اجزاء کو سمجھے بغیر سیاسی تاریخ نویسی کے انداز میں ہر بات کا دستاویزی ثبوت طلب کر کے تہذیبی تاریخ مرتب نہیں کی جا سکتی۔ فن تحقیق کے اس رمز کو ڈاکٹر زور نے سمجھا تھا اور خوب سمجھا تھا۔ ڈاکٹر زور پر بعض تنقیدیں ان کے اسی انداز اور معیارِ تحقیق کی وجہ سے ہوئی ہیں لیکن ادبی اور تہذیبی بصیرت کی بالیدگی کے ساتھ محسوس کیا جائے گا کہ جن امور کو موجب تنقید سمجھا گیا دراصل وہ لائق تحسین تھے۔

ڈاکٹر زور نے دکنی ادب کے ساتھ اس کا ماحول بھی پیش کیا۔ قطب شاہی دور کی

تہذیب اپنے محور اور جگہ سے ہٹ چکی تھی۔ اس کی جگہ مغل برطانوی تہذیب کا اثر نمایاں تھا۔ ڈاکٹر زور نے داستان سرائی، روایت، حکایت وغیرہ سے وہ ماحول ابھارا جس کی وجہ سے دکنی ادب کو سمجھنا آسان ہوگیا اور اس کی حقیقی قدر و منزلت کا تعین بھی ممکن ہو سکا۔

ڈاکٹر زور کے تحقیقی کاموں میں بعض غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی کی جاتی ہے اور اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کا یہ کام اعلیٰ معیار کا نہیں ہے یا ادھورا ہے یہ اعتراض درحقیقت درست اور بجا نہیں ہے۔ تحقیق میں کوئی کام اور کوشش حرفِ آخر نہیں ہوتی۔ پہلے پہل کام شروع کرنے والوں کا کام لاکھ کوششوں کے باوجود ادھورا رہ جاتا ہے کیونکہ تمام ماخذ ان کی نظروں کے سامنے نہیں ہوتے۔ کتنے ہی گوشے ان کی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں جو ماخذ چھوٹ جاتے ہیں۔ ان سے استفادہ کرتے ہوئے مستقبل کے محقق تحقیق کو آگے بڑھاتے ہیں کلیات محمد قلی قطب شاہ کو ڈاکٹر زور نے آج سے ۲۶ سال قبل ترتیب دیا تھا۔ اگر کوئی محقق آج دوبارہ اس پر نظر ڈالتے ہوئے ڈاکٹر زور کے کام میں کچھ عیب پاتا ہے تو اس میں حیرت اور تعجب کی بات نہیں ہے۔ دکنی ادب پر تحقیقی کام کافی آگے بڑھ چکا ہے۔ اب ڈاکٹر زور کے کام کو آگے بڑھانا ممکن ہے۔ نئے ماخذوں اور نئی تحریری شہادتوں کی روشنی میں محمد قلی کے سوانحی حالات میں کچھ رد و بدل بھی ممکن ہے۔ ڈاکٹر زور جن گرہوں کو کھول نہیں سکے تھے اور جن غیر مانوس الفاظ کے معنی و مفہوم کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے تھے ان میں سے اکثر و بیشتر گرہیں کھل چکی ہیں اور غیر مانوس الفاظ کے معنی و مفہوم بھی واضح ہوتے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر زور بسیار نویس تھے وہ کسی ایک تصنیفی و تالیفی کام پر زیادہ وقت دینے کے قایل نہیں تھے۔ وہ طویل مدت تک ایک تصنیف کی چھان پھٹک اور اس پر نظر ثانی کی بجائے کسی دوسرے علمی ادبی کام کے آغاز کو بہتر اور مناسب سمجھتے تھے۔ یہ ڈاکٹر زور کا علمی رویہ تھا۔ ان کے خیال میں کوئی بھی علمی اور ادبی کام حرف آخر کی حیثیت نہیں رکھتا۔ تحقیق طلب امور پر مواد کی فراہمی اور کوتاہیوں کی نشان دہی اور ان کی اصلاح مستقبل کے ادیب و محقق کا کام ہے اس علمی رویۓ اور ان کی بسیار نویسی نے ان کے تحقیق کے کام کے معیار کو کچھ نقصان ضرور پہنچایا ہے تاہم اُردو ادب میں تحقیقی کام کا ایک بہت اہم اور قابل قدر ذخیرہ اکھٹا ہو گیا۔

بعض ناقدین نے مذکورہ بالا اعتراضات کی روشنی میں ڈاکٹر زور کے تحقیقی کاموں کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر زور کے تحقیقی کارناموں کی اہمیت مسلّمہ ہے اور ان کی قدر و قیمت کم نہیں کی جا سکتی۔ اصل میں یہ اعتراضات کم بصری پر مبنی ہیں۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے تاریخ اُردو ادب اور اُردو ادب کے ماحول سے ڈاکٹر زور کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو یکسر بھلا دیا جائے اور اس کے بعد دیکھا جائے کہ کیا ڈاکٹر زور کے بغیر بھی اُردو زبان اور ادب آج جس مقام پر ہیں کیا وہیں ہو سکتے تھے۔

اس اعتبار سے اگر ڈاکٹر زور کو اُردو زبان و ادب کی دنیا میں تاریخ ساز اور عہد ساز شخصیت کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ انھوں نے اس زبان اور ادب کے ایک عہد کی بازیافت کی جس کی وجہ سے زبان و ادب کی تاریخ کو از سر نو لکھنا

ضروری ہوگیا۔ انھوں نے یہ عظیم کارنامہ ایک انشا پرداز، ایک مصنف، محقق، نقاد، دکنی ادبیات کے ایک ماہر اور ماہر لسانیات کے زورِ قلم کے ذریعہ ہی نہیں بلکہ اپنی ذات کو ایک ادارہ میں تبدیل کرکے سرانجام دیا وہ مجسم تحریک مجسم ادارہ اور عزم وارادہ اور عمل کی بے پناہ قوتوں کا سرچشمہ تھے۔

ڈاکٹر زور کے ساتھ جو تحقیقی کارنامے جو ادارے اور جو شخصیتیں وابستہ ہیں اور جن کے ذریعہ ڈاکٹر زور نے اردو زبان وادب کے ایک کھوئے ہوئے ورق کی جس طرح بازآفرینی کی اور اس کو جس طرح زندگی عطا کی اس کا اظہار کسی جائزے کے انتقادی کلمات سے کہیں بہتر کسی مصور کے نقش ہی سے ممکن ہے اُردو ادب میں بہت کم ایسی شخصیتیں گذری ہیں جن کے جہد وعمل نے مصوروں کے لیے نگارخانے چھوڑے ہوں۔

۵۵

# اُردو کی ایک بے بدل شخصیت

# پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کی شخصیت بہ حیثیت مجموعی ایک ایسی ہمہ گیر اور بلند قامت شخصیت ہے جو کسی بھی زبان وادب اور اس کی تہذیب کا سرمایہ سمجھی جا سکتی ہے۔ خوش قسمتی سے یہ شخصیت اُردو زبان، اس کے ادب اور اس کی مشترکہ تہذیب کو میسّر آئی۔

کیفی کا تعلق اس مردم خیز سرزمین سے ہے جسے جنت نشان کشمیر کہا جاتا ہے۔ یہاں کی خاک سے کتنے ہی جگمگاتے ہوئے لعل وجواہر برصغیر کو نصیب ہوئے جنہوں نے اس برصغیر کی سیاست اور تہذیب کو مالا مال کر دیا۔ اقبال اور چکبست کی طرح کیفی کے آبا واجداد کا تعلق بھی کشمیر سے تھا۔

پنڈت کیفی کا شمار اُردو کے ان گنے چنے محسنوں میں کیا جاتا ہے جنہوں نے نہ صرف علمی، ادبی اور تحقیقی کاوشوں ہی کے ذریعہ اُردو زبان کی خدمت کی بلکہ اُردو زبان کی اشاعت وفروغ میں عملی طور پر حصہ لیا۔ کیفی نے اُردو زبان اور اُردو تحریک کی جس لگن، خلوص اور خاموشی سے خدمت کی اس کی

مثال ملنا مشکل ہے۔ اردو زبان اور تحریک سے زندگی کے آخری لمحوں تک ان کی دل چسپیوں میں کوئی فرق نہیں آیا اس زبان نے ان سے آخری وقت تک کسب فیض کیا۔

یوں تو ان کی ساری زندگی اردو زبان اور اردو تحریک کی خدمت سے عبارت ہے لیکن بالخصوص ملک کی تقسیم کے بعد اس میدان میں ان کی شخصیت بہت اہم اور نمایاں حیثیت حاصل کر گئی تھی۔ پنڈت جی کی شخصیت ہندو مسلم تہذیب کا خوب صورت امتزاج تھا۔ پچھلی صدی کے بہترین مگر مٹے ہوئے نقوش اور آثار ان کی شخصیت میں پوری طرح جلوہ گر نظر آتے تھے۔ اردو زبان و ادب کی خدمت اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی اتحاد کو انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تھا۔ کئی انقلابات گذر گئے اور زمانے نے کئی کروٹیں بدلیں۔ لیکن ان کی ثابت قدمی میں کبھی فرق نہیں آیا۔ از ابتدا تا دمِ مرگ زندگی کے اعلیٰ اقدار اور اپنے نصب العین سے ایک سچے عاشق کی طرح پیار کرتے رہے اور کبھی ان کی چاہت میں کمی نہیں آئی ؎

پتھر کی چھاتی چاہیے ہے میر عشق میں
جی جانتا ہے اس کا جو کوئی وفا کرے

اب ایسی وضعدار اور مخلص بزرگ ہستیاں کہاں جو تمام مصلحتوں سے دور اپنے عمل اور برتاؤ میں اٹل اور بے لاگ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ پنڈت کیفی اردو دنیا میں بڑی عزت اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

پنڈت دتاتریا کیفی کے اجداد ۱۸ ویں صدی کے آغاز کے بعد کشمیر سے دہلی منتقل ہو چکے تھے۔ یہ وہ دور تھا جب معزز خاندانوں کے لیے فارسی دانی بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ انھوں نے فارسی میں عبور حاصل کرنے کے لیے مکتب

کی مروجہ تعلیم پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے نانا سے بھی رجوع ہوئے جو اس زبان کے ایک جید فاضل سمجھے جاتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے انگریزی تعلیم پر بھی پوری توجہ کی۔ انھیں چونکہ ہندی پر بھی عبور ہو گیا تھا اس لیے سنسکرت سے بھی اچھی خاصی واقفیت حاصل ہو گئی۔ اُردو اور فارسی پر عبور نے انھیں عربی سے بھی اسی طرح آشنا کر دیا جس طرح کہ وہ سنسکرت سے آشنا تھے۔

رتن ناتھ سرشار، دیا شنکر نسیم۔ چکبست اور پریم چند کی طرح کیفی بھی اُردو کی ان نمائندہ شخصیتوں میں سے ہیں جو اس زبان کی سیوا کرنے میں اس کے دوسرے فرزندوں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ یہ وہ نمائندہ شخصیتیں ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ اُردو زبان کا تعلق کسی ایک مذہب، عقیدہ یا طبقہ سے نہیں بلکہ حقیقی معنی میں یہ ہندوستان کی قومی زبان ہے جو اپنے سیکولر کردار کی وجہ سے رابطہ کی زبان ہونے کے علاوہ مشترکہ تہذیب کی بھاشا بھی ہے۔

عمر دراز اس صورت میں یقیناً خوش نصیبی بن جاتی ہے جب کہ اس کا ایک ایک پل رائیگاں نہ جائے۔ کیفی کا گنج گراں مایہ بھی محبت، دوستی، بھائی چارہ، نیکی، راستی، شرافت، وطن دوستی انسانیت دوستی کے اعلیٰ اقدار اور قابل قدر روایات کو پروان چڑھانے میں صرف ہوا۔

کیفی نے جب آنکھیں کھولیں تو ہندوستان کی تاریخ ایک کروٹ لے چکی تھی۔ اس وقت ساری دنیا تغیر اور تبدیلی کے فیصلہ کن مراحل سے گذر رہی تھی۔ تغیرات اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک مسلسل عمل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن ان میں ایسے بھی مرحلے آتے ہیں جب تغیرات ایک قطعی شکل حاصل کر لیتے ہیں۔

کیفی جب پیدا ہوئے تو ہندوستان میں شاہی ختم ہو چکی تھی۔ جنگ

آزادی سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کا دور بھی گذر چکا تھا۔ ایک نئی تہذیب اور ایک نئی زندگی برصغیر میں کروٹ لے رہی تھی۔ انگریزی تعلیم کے ذریعہ ملک مغرب کی جدید تبدیلیوں، جدید فکر اور فلسفہ اور نئی معاشی اور سماجی تبدیلیوں سے آگاہ ہوتا جا رہا تھا۔ نئی صنعتی سرگرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا اور شاہی جاگیرداری اور زمین داری کے دور سے نکل کر ملک ایک نئے صنعتی دور کی دہلیز پر کھڑا ہو چکا تھا۔

پنڈت جی نے بھی ان نئی تبدیلیوں اور نئے حالات کو دیکھا۔ نئے تقاضوں کو محسوس کیا اور قدامت سے چمٹے رہنے کی بجائے جدید اور ترقی پذیر میلانات اور رجحانات کا خیر مقدم کیا۔ نئے علوم و فنون کی طرف راغب ہوئے انگریزی تعلیم حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت میں قدیم اور جدید کا ایک متوازن امتزاج ہونے لگا۔ بنگال، پنجاب اور دہلی میں چلائی جانے والی تحریکات سے انھوں نے اپنے آپ کو وابستہ کیا۔ اردو کے ادیب، شاعر، محقق، عالم اور خدمت گذار کی حیثیت سے انھوں نے حالی اور سرسید سے گہرے اثرات قبول کیے اور اس کا اظہار صرف اپنی تخلیقات ہی میں نہیں کیا بلکہ اپنی ساری شخصیت، سوچنے اور سمجھنے کے انداز اور اپنے طرزِ زندگی میں بھرپور انداز میں کیا۔

اس کا ایک کھلا ثبوت پنڈت کیفی کا مسدس "بھارت درپن" ہے جو ۱۹۰۵ء میں تصنیف کیا گیا۔ جس طرح حالی نے مسدس لکھ کر مسلمانوں کو جھنجوڑنے اور خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی تھی بالکل اسی طرح پنڈت کیفی نے بھارت درپن میں ہندوستان کی عظمت اور عروج کے دور کی یاد دلاتے ہوئے اس دور کے زوال اور پستی کا نقشہ کھینچ کر ہندوستان کو قعرِ ذلت

سے نکلنے اور ترقی کے راستہ پر آگے بڑھنے کے لیے اکسایا۔

پنڈت کیفی کو شعر و سخن کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ انھوں نے کم عمری ہی سے شعر کہنا شروع کیا اور شاعری کی ابتداء رواج زمانہ کے مطابق غزل گوئی سے کی لیکن جدید رجحانات اور تحریکات کے زیر اثر نیچرل شاعری کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ یوں تو پنڈت جی نے تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی لیکن ان کی زیادہ تر توجہ غزل اور نظم کی جانب ہی رہی۔

ان کی غزلوں میں زبان وبیان کی چاشنی ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ محاورہ کا لطف اور تاثیر کی خصوصیت بھی پائی جاتی ہے اور دبستان دہلی کا انداز جگہ جگہ اپنے آپ کو آشکار کرتا ہے۔

ان کی نظمیں مناظر فطرت کی حسین عکاسی اور زبان وبیان کی دلکشی کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ لیکن جو چیز خصوصیت کے ساتھ ان کے کلام میں نمایاں ہے وہ ان کی قادرالکلامی اور کہنہ مشقی ہے۔ قاری ان کی شاعری کی اس خصوصیت کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

شاعری کے علاوہ ادب کے بعض دیگر اصناف مثلاً افسانہ، ناول اور ڈرامہ پر بھی پنڈت کیفی نے توجہ کی ہے۔ لیکن درحقیقت لسانیات اور تحقیق ان کا خاص میدان ہے۔ ان موضوعات پر ان کی دو تصانیف منشورات۔ کیفیہ اور دیگر چند مضامین موجود ہیں۔

منشورات سنہ ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئی۔ جس میں وہ ۱۲ علمی و ادبی لکچر اور مضامین شامل ہیں جو سنہ ۱۹۱۰ء اور ۱۹۳۴ء کے دوران میں لکھے گئے۔ ان میں چند لکچر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد۔ اردو سبھا لاہور، انجمن اردو لکھنو اور انجمن ارباب علم

لاہور میں دیئے گئے تھے۔ ان خطبات اور مضامین میں ایک خاص قسم کا ربط موجود ہے اور وہ ہے اُردو زبان سے پنڈت کیفی کی بے پناہ محبت اور اردو ادب کی ترقی اور فروغ کے لیے ان کے پُر خلوص مشورے۔

اُردو زبان اور ادب کی ترقی و توسیع میں قدما نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے اور زبان کی تدوین و تزئین کے جو اصول وضع کیے تھے ان کا جائزہ لیتے ہوئے زبان و ادب کی ترقی کی موجودہ رفتار پر پنڈت کیفی نے بڑی مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ اُردو زبان میں اس دور میں جو بے راہ روی پیدا ہو رہی تھی اس سے وہ بے حد خائف تھے۔ ان کے خطبات اور مضامین میں جگہ جگہ زبان کی غلطیوں کے بارے میں اشارے، مثالیں اور عالمانہ بحثیں ملتی ہیں۔

وہ عربی و فارسی الفاظ اور تراکیب سے اُردو کو مشکل اور ثقیل بنانے کے مخالف تھے۔ انھیں پروفیسر وحیدالدین سلیم سے مکمل اتفاق تھا کہ اگر اُردو کو ہندوستانی زبان بنانا منظور ہے تو اسے عربی ایرانی کی بجائے ہندا لمانی زبان بنایا جائے۔

علمی استطاعت میں ترقی کے ساتھ وہ زبان کی لطافت اور ترنم کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ الفاظ کے ذخیرہ میں اضافہ اور زبان کی اصلاح و ترمیم کو ضروری سمجھتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس بات کو مدنظر رکھنے کی بھی تاکید کرتے ہیں کہ جو خوبیاں پہلے سے اُردو میں موجود ہیں وہ کہیں زائل نہ ہو جائیں انھوں نے زبان کے نقائص، عیوب اور کمزوریوں کی اصلاح اور مختلف دبستانوں میں تذکیر و تانیث و متروکات وغیرہ کے اختلافات کو دور کرنے اور ان کا حل تلاش کرنے کے لیے معقولیت، بالغ نظری اور فراخ دلی کو پیش نظر رکھنے کا

مشورہ دیا۔ وہ ان مسائل کو حل کرنے پر زور دیتے ہوئے اُردو والوں سے ماضی کی روشنی میں اعلیٰ اور معیاری کارنامے سرانجام دینے کی جانب توجہ دلاتے ہیں۔ متذکرہ بالا مسائل اور زبان اور ادب کی جانب بے توجہی کا عالم دیکھ کر انہیں یہ خوف لاحق تھا کہ کہیں یہ سست رفتاری اور غفلت جمود کی کیفیت نہ اختیار کرے اور اُردو زبان آثار قدیمہ بن کر نہ رہ جائے۔

اُردو زبان و ادب کے جن چند مسائل کا تذکرہ ان خطبات اور مضامین میں ملتا ہے وہ مسائل موجودہ مسائل سے یقیناً مختلف ہیں۔ مسائل کی تبدیلی، حالات کی تبدیلی کا منطقی نتیجہ ہوتی ہے۔ لیکن یہ کتاب اس دور کے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

پنڈت کیفی نے لسانیاتی موضوعات پر کئی مضامین قلمبند کیے تھے جو کیفیہ کے نام سے سنہ ۱۹۴۲ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ جیسا کہ خود پنڈت کیفی کہتے ہیں۔ برسوں کی تحقیق، مطالعہ اور سوچ بچار کے نتیجے اس کتاب میں محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔ اس کتاب کو اُردو لسانیات کے ابتدائی اہم کاموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ پہلے باب میں اُردو زبان کی مختصر تاریخ کے تحت زبان کے آغاز و ارتقا کی کھوج لگانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس وقت اس میدان میں جو تحقیقی کام ہو چکا تھا اس سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی ہمہ گیر معلومات کی روشنی میں پنڈت کیفی نے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان سے آج اختلاف ممکن ہے کیونکہ پنڈت کیفی کی اس تصنیف کے بعد اس موضوع پر، سائنٹیفک بنیادوں پر کافی تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ اور چند نئے نظریات سامنے آئے ہیں۔ تاہم اس کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ پنڈت جی کے تمام ماخذ مستند اور معتبر ہیں اور

موضوع سے ان کی واقفیت بہت گہری ہے۔ انھوں نے اپنی وسیع معلومات کی روشنی میں بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے دوسرے ابواب میں زبان کے بنیادی عناصر کے بارے میں تمام بحثیں خالص علمی ہیں اور جو نکات بیان کیے گئے ہیں وہ بہت اہم اور بیش قیمت ہیں تحقیق صبر آزما اور محنت طلب کام ہے جس میں وسیع معلومات اور دقت نظری درکار ہے۔ پنڈت کیفی نے اپنی تصانیف اور تحریروں میں تحقیق کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ علمی اور فنی رموز و نکات کو واضح اور سلیس انداز میں بیان کرنے پر انھیں قدرت حاصل ہے۔ آج جبکہ اُردو لکھنے والوں کی تحریروں میں زبان کی غلطیاں عام ہیں اور صحت زبان سے لاپروائی برتی جا رہی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ بہت کارآمد اور مفید ثابت ہوگا۔

علم لسانیات، قواعد، محاورہ اور روزمرہ سے انھیں ابتدا ہی سے دلچسپی تھی۔ اُردو میں انشاء اللہ خاں انشاء کی تصنیف "دریائے لطافت" اس موضوع پر سب سے پہلی اور بڑی اہم کتاب ہے۔ اس کتاب کو مولوی عبدالحق نے مرتب کر کے طبع کروایا تھا۔ لیکن جب مولوی صاحب نے محسوس کیا کہ کتاب فارسی زبان میں ہونے کی وجہ سے پڑھنے والوں کا دائرہ محدود ہے تو انھوں نے طبع ثانی میں اس تصنیف کا اُردو ترجمہ شائع کیا۔ ترجمہ پنڈت کیفی نے کیا جو بہت سلیس رواں اور بامحاورہ ہے۔ اس کتاب میں کئی مفید حواشی بھی شامل ہیں جن سے قاری پر اہم نکات واضح ہو جاتے ہیں۔

عمر کے معاملے میں قدرت نے کیفی صاحب کو بڑی فیاضی سے نوازا تھا۔ تقریباً پون صدی تک علمی، ادبی، شعری، تحقیقی غرض یہ کہ وہ اردو زبان سے

متعلق ہر قسم کی تعمیری اور بامقصد سرگرمیوں اور تحریکوں سے وابستہ رہے
پنڈت کیفی کے انتقال پر ڈاکٹر زور نے ان کی شخصیت کو پر اثر الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا تھا انھوں نے لکھا تھا کہ "ان کی وفات سے اُردو دنیا ایک ایسے محسن سے محروم ہو گئی ہے جس کا بدل ملنا ممکن نہیں ہے۔ اردو میں شاعر ادیب، ماہر لسانیات اور عروض و قواعد کے جدا جدا ماہر پیدا ہوتے رہیں گے۔ لیکن شاید ہی کوئی ایسا پیدا ہو جو ان سب میں پنڈت کیفی کی طرح ایک خصوصی اہمیت کا مالک ہو"۔

کس قدر حیرت اور افسوس کی بات ہے کہ پنڈت کیفی کی قابلِ احترام شخصیت اور گراں قدر خدمات، اور کارناموں کو اُردو دنیا نے فراموش اور نظر انداز کر دیا ہے حالانکہ پنڈت کیفی ماضی قریب کی چند اہم شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پنڈت کیفی کی شخصیت اور کارناموں پر تحقیقی کام کیا جائے اور اردو ادب میں ان کی جگہ متعین کی جائے۔ اردو والوں کی اس بارے میں غفلت پنڈت کیفی کے ساتھ ناانصافی تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کوتاہی کے سبب اردو لسانیات اور تحقیق کے ارتقا کی کہانی بھی ادھوری رہ جائے گی۔

□□

# مخدوم — چند یادیں

اس مضمون میں نہ تو مخدوم صاحب کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور نہ ہی یہ مضمون ان کی شخصیت کے سبھی پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ اس میں ان چند یادوں اور باتوں کا تذکرہ ملے گا جنھیں میں اپنی کتاب " مخدوم —— ایک مطالعہ " اور اس کتاب کی اشاعت کے بعد لکھے گئے اپنے مضامین میں شامل نہیں کر سکا تھا۔ اس مضمون کو قلمبند کرنے سے میرا خیال ہے کہ یہ چند یادیں ضرور محفوظ ہو جائیں گی ساتھ ہی ساتھ مخدوم صاحب کی شخصیت کے چند نقوش بھی کہیں نہ کہیں ضرور ابھریں گے۔

مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ میں نے مخدوم صاحب کا نام کب سنا تھا۔ لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ان کے چرچے گھر گھر اور شہرت افسانہ در افسانہ سارے شہر میں پھیلی ہوئی تھی۔ ۱۹۵۲ء میں جیل سے رہائی کے بعد ان کے اعزاز میں شاندار خیر مقدمی جلسے منعقد ہوئے عظیم الشان جلوس نکالے گئے۔ اس وقت وہ اپنے علاقے میں عوام کی مقبول ہی نہیں محبوب اور مرکزی شخصیت بن گئے تھے۔

ہم اپنے راستوں میں گھر میں محلہ میں بازار میں ہر جگہ بڑے اشتیاق کے ساتھ ان کے متعلق باتیں سنتے اور حیرت اور مسرت کا اظہار کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد کئی سال گذر گئے۔ شعور کی پختگی کے ساتھ ہی ساتھ بحیثیت شاعر و عوامی رہنما مخدوم کی شخصیت افسانوی پیراہن میں نہیں بلکہ حقیقی شکل میں ہمارے سامنے آئی لیکن مخدوم کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ پہلی بار اس وقت میسر آیا جب حیدرآباد میں چند باذوق نوجوانوں نے جنھیں دوسری دل چسپیوں کے علاوہ فلموں سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ فلم اسٹڈی سرکل کے نام سے ایک ادارہ کی بنا ڈالی تھی۔ اپنی طرز کے اس پہلے اور اچھوتے ادارے کی صدارت کے لیے ان نوجوانوں نے جن میں خوش قسمتی سے میں بھی شامل تھا مخدوم صاحب کا انتخاب کیا تھا حالاں کہ مخدوم صاحب کو فلموں سے نہ تو خاطر خواہ دل چسپی تھی اور نہ ہی دل چسپی لینے کے لیے وقت تھا۔ ان کا ماحول بھی اس کے لیے سازگار نہیں تھا۔ ہم نوجوان چاہتے تھے کہ مخدوم کی ہمہ جہت شخصیت فلموں کے تعلق سے بھی دل چسپی لے۔ خیر یہ ایک علٰحدہ بحث ہے۔ مجھے تو صرف یہ بات کہنی ہے کہ اس سرکل سے اپنی وابستگی کی وجہ سے میں پہلی بار مخدوم صاحب سے قریب ہو سکا۔ اس ادارہ کی افتتاحی تقریب بھی کئی باتوں کی وجہ سے ایک یادگار تقریب تھی۔ لیکن اس تقریب کے اس منظر کو میں کبھی نہیں بھول سکتا جب فائن آرٹس اکیڈیمی کے فن کار کورس کی شکل میں "چاند تاروں کا بن" ساز کے ساتھ اسٹیج پر پیش کر رہے تھے۔ اس نظم کی معنویت اور اشاریت کے ساتھ سامعین کی محویت اور دل چسپی اور فن کاروں کا ڈوب کر اسے سنانا، نغمہ، معنی اور تاثر کا ایک ایسا امتزاج پیش

کر رہا تھا کہ اس کیفیت کو محسوس ہی کیا جا سکتا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ سب سے زیادہ متاثر اس تقریب کے مہمان خصوصی بلراج ساہنی تھے جن کی اہمیت اداکار ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ادیب، دانش ور اور ترقی پسند فن کار ہونے کی وجہ سے تھی۔ فن کاروں نے جب یہ کورس ختم کیا تو سارا ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ صرف ایک شخص تالیوں کے ذریعہ اپنے جذبات کا اظہار کرنے میں اپنے آپ کو معذور پا رہا تھا اور وہ تھے بلراج ساہنی کیونکہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ چاند تاروں کا بن کا سارا پس منظر ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ شہیدوں کے جلتے ہوئے تن گویا انھیں آنکھوں کے سامنے نظر آ رہے تھے جب فن کاروں کی زبان سے نکلا تشنگی تھی مگر —— تو گویا انھیں اس کیفیت کا احساس ہونے لگا جس سے جدوجہد آزادی کے زمانے میں وہ ان کے ساتھی سرشار ہو چکے تھے۔ بلراج ساہنی نے بے اختیار روتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں اور بڑے ہی ملتجیانہ انداز میں اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر یہ فن کار ایک بار پھر یہ نظم سنا دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ چنانچہ ایک بار پھر اسی انداز میں بلکہ اور بھی متاثر ہو کر ان فن کاروں نے مخدوم کی نظم "چاند تاروں کا بن" سنائی۔ اس سے قبل یہ فن کار سینکڑوں مرتبہ یہ نظم پیش کر چکے تھے۔ لیکن اس بار جو کیفیت پیدا ہوئی جو سماں نغمہ و معنی نے ہم آہنگ ہو کر باندھا وہ کچھ اور ہی تھا۔ مخدوم کے اشعار میں کتنی قوت ہے، تاثیر ہے اور معنی و مفہوم کی جو گہرائی ہے اس کا زندہ ثبوت پہلی بار میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس تقریب میں مخدوم بھی تھے تقریب کے اختتام کے بعد کافی دیر تک بلراج ساہنی اور مخدوم کے ساتھ ہم نوجوانوں کو نمائشی کلب میں بیٹھے باتیں

کرنے کا موقع ملا۔ بلراج ساہنی نے جس کیفیت کا اظہار اپنے آنسوؤں سے کیا تھا بات چیت کے دوران میں، انھوں نے الفاظ میں بھی اُسے ظاہر کیا۔ مخدوم اس سارے واقعہ میں بڑے خاموش لیکن ساتھ ہی ساتھ بے حد مسرور اور مطمئن دکھائی دے رہے تھے۔ شاعر کو اور کیا چاہیے۔ ایسی داد ملے تو شاعر یقیناً اسے کسی بھی ایوارڈ اور اعزاز سے بڑا ہی سمجھے گا۔

اس تقریب کے بعد مخدوم کے ساتھ عقیدت اور محبت کا رشتہ اور بھی استوار ہوتا گیا چنانچہ جامعہ عثمانیہ سے اُردو میں ایم۔ اے کرنے کے لیے جب مقالے کے لیے موضوع کے انتخاب کا سوال آیا تو میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ اس جامعہ سے یم۔ اے کرنے والے اس کے بہترین سپوت مخدوم کو اس مقالہ کا موضوع نہ بنایا جائے۔ میرے اس انتخاب پر کچھ لوگ چونک گئے کیونکہ یہ پہلا موقع تھا جب جامعہ عثمانیہ میں ایم۔ اے (اُردو) کے لیے حیدرآباد کی ایک ادبی شخصیت کو مقالہ کا موضوع بنایا گیا تھا جو ہمارے روبرو ایک جیتی جاگتی لیکن قدآور ادبی شخصیت تھی۔ روایت سے اس انحراف کے باوجود کسی نے میرے انتخاب کی مخالفت نہیں کی کیونکہ ایسی مخالفت ادبی بددیانتی کے مترادف ہوتی۔ مخدوم صرف حیدرآباد ہی کی مرکزی ادبی شخصیت نہیں تھے بلکہ وہ ساری اردو دنیا میں اپنے ہم عصر شعراء اور ادبی شخصیتوں میں نہایت اہم، جداگانہ اور نامور شخصیت تسلیم کیے جاتے تھے۔

جہاں تک مخدوم کے سیاسی نظریات اور عقائد کا تعلق ہے اس بارے میں ان کی استقامت ان کی شخصیت کا ایک واضح مگر اہم پہلو ہے۔ اُن کا بچپن مذہبی ماحول میں گذرا۔ نوجوانی میں اشتراکی نظریات کے مطالعہ

اور اُن کے بارے میں غور و فکر کرنے کے بعد انھوں نے ان نظریات اور عقائد کو اپنایا اور بلا کسی تاخیر کے عملی طور پر کام کا آغاز کر دیا۔ وہ ان نظریات کا گہرا مطالعہ کر کے ایک دانشور کی حیثیت سے اس فلسفہ حیات کی تعبیر اور تبلیغ کر سکتے تھے۔ کوئی بھی ایسا دوسرا راستہ آسانی کے ساتھ اختیار کر سکتے تھے جو معاشی آسودگی میں بھی ممد و معاون ثابت ہوتا لیکن انھوں نے دشوار گذار راستہ کا انتخاب کیا اور پورے خلوص کے ساتھ اپنے مشن کا آغاز کیا۔ کسی اُونچے اور بلند مقام پر متمکن ہو کر ہدایات دینے کی بجائے ایک کسان کی طرح اپنے ہاتھوں سے کاشت کر کے اپنی محنت کا ثمر پانے کی کوشش کی۔

ان کی روزمرہ مصروفیت کو چند روز قریب رہ کر دیکھنے پر اس بات کا کوئی بھی بآسانی اندازہ کر سکتا تھا کہ انھیں اپنے کام اور مشن سے کتنی والہانہ دل چسپی تھی اور وہ اپنا کام کس خلوص اور انہماک سے کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ کسی بھی گوشہ سے اُن پر ایسا الزام نہیں لگایا گیا جیسا کہ عام طور پر سیاست دانوں پر لگایا جاتا ہے ان کے تصورات اور نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا تھا لیکن ان کے خلوص، بے نفسی اور ان کی بے لوث خدمات پر کسی کو شک نہیں تھا۔ وہ بہت بڑے سیاست داں نہ سہی۔ لیکن سیاست کے دلدل میں ایک ایسے گلِ تر کی طرح تھے جس کی دل آویزی مثالی تھی۔ سیاسی زندگی میں ان کی شرافت، وضع داری، شائستگی، بے غرضی، ایثار و قربانی اور اونچے اُصولوں اور اعلیٰ اقدار سے ان کا بے پناہ پیار انھیں اپنوں ہی میں نہیں سیاسی بیگانوں کی نظر میں بھی بلند کر چکا تھا۔

اجتماعی زندگی میں جس نے ان کا جو روپ دیکھا اس سے متاثر

ہو گیا۔ کوئی شاعر مخدوم کا فریفتہ تھا تو کسی کو عوامی رہنما کی حیثیت سے ان کی شخصیت میں بڑی کشش نظر آتی تھی دوستوں کی محفل میں وہ ایک بہترین دوست تھے۔ بذلہ سنجوں، لطیفہ گوؤں، زندہ دلوں کی نشست میں ان سے بہتر بذلہ سنج اور ان سے اچھا لطیفہ گو نہیں مل سکتا تھا۔ ان کی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کے تذکرہ پر مجھے یاد آیا کہ ایک مرتبہ اُردو ہال میں انجمن ترقی اُردو کی مجلس عاملہ کے اجلاس کے بعد کسی صاحب نے ڈاکٹر گوڑ سے مخصوص لطیفہ سنانے کی خواہش کی تاکہ مسائل پر غور و خوص کے بعد سنجیدہ ماحول شگفتہ بن جائے۔ گوڑ صاحب نے کہا۔ جس محفل میں مخدوم ہوں وہاں کسی اور کو لطیفہ سنانے کا حق نہیں پہنچتا۔ میں اردو ہال اپنے مقالہ کے سلسلہ میں بات چیت کرنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس محفل میں سب ہی مخدوم کے بے تکلف دوست نہیں تھے۔ ان میں چھوٹے، بڑے، بزرگ اور ایسے حضرات بھی شامل تھے جن سے مخدوم کی زیادہ بے تکلفی نہ تھی لیکن مخدوم کے شگوفے شروع ہو گئے۔ انھوں نے اپنے لطیفہ گوئی کے انداز کو ماحول کا لحاظ کرتے ہوئے ڈھال لیا تھا۔ کافی دیر تک قہقہے گونجتے رہے۔ چند لطیفے وہاں موجود ایک خاص دوست کو ٹارگٹ بنا کر سنائے گئے تھے۔ اُردو ہال کی اس محفل کے برخواست ہونے پر جب میں مخدوم صاحب کے ساتھ واپس ہو رہا تھا تو مخدوم صاحب کو رخصت کرنے والے اس خاص دوست اور ساتھی کو بے مزہ نہیں پایا، مصنوعی ناراضگی لیکن حقیقی معنی میں شکر گذاری کے لہجے میں جیسے وہ کہہ رہے تھے، سنانے والے کے لب اتنے شیریں ہیں کہ گالیاں کھا کے بے مزہ ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ لطیفے تو لطیفے ٹھہرے۔

جن دنوں میں مخدوم پر مقالہ لکھنے میں مصروف تھا میں نے مخدوم کے ایک

قریبی اور عزیز دوست میر حسن صاحب سے بھی انٹرویو لیا تھا۔ میر صاحب نے جو طالب علمی کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی برسوں مسلسل مخدوم کے ساتھ رہے تھے مجھے تفصیلی انٹرویو دیتے ہوئے ایک واقعہ سنایا تھا جس سے اس بات کا اندازہ ہوا کہ مخدوم حیدرآباد میں روپوشی کے وقت بھی ایک ہیرو کی طرح مقبول تھے۔

جس وقت مخدوم روپوش ہو گئے تھے۔ میر حسن صاحب اورنگ آباد میں تھے۔ چند روز بعد وہ حیدرآباد آئے۔ موٹر میں عابد روڈ کے ایک ہوٹل پر پہنچ کر چائے منگوائی۔ اُن کے دوست سرور بیابانی بھی ان کے ہمراہ تھے جس وقت وہ اور ان کے دوست موٹر میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ چند لوگ انھیں بغور دیکھ رہے ہیں۔ چند ہی منٹ میں ۲۵، ۳۰ افراد موٹر کے قریب پہنچ گئے۔ ہوٹل کے تقریباً سب ہی ملازمین اور مالک کے علاوہ چند اور لوگ بھی وہاں موجود تھے۔ وہ سب ان کی طرف دیکھ رہے تھے ان میں سے ایک شخص کے ہاتھ میں ایک رسالہ تھا اور ۵، ۶ آدمی بار بار اس رسالہ کو دیکھتے تھے اور پھر ان کی طرف دیکھتے تھے۔ چائے ختم ہوئی تو میر حسن صاحب نے ہوٹل کے ملازم کو جو بازو ہی کھڑا تھا ایک روپیہ کا نوٹ دیا مگر ہوٹل کے مالک نے فوراً آگے بڑھ کر کہا "صاحب آپ آگئے، ہم کو بہت خوشی ہوئی۔ ہم آپ سے پیسے نہیں لیں گے!" میر حسن صاحب کو فوراً خیال آیا کہ وہ لوگ انھیں مخدوم سمجھ رہے تھے۔ پھر انھوں نے موٹر میں سے اتر کر ان لوگوں کو سمجھایا کہ انھیں غلط فہمی ہوگئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان لوگوں نے پیسے نہیں لیے اور بڑی دیر تک مخدوم کی قصیدہ خوانی کرتے رہے۔ اس مجمع میں ہندو، مسلم

امیر، غریب سبھی شامل تھے۔

عام طور پر فن کار کے مزاج میں لاابالی پن اور زندگی کی جانب غیر ذمہ دارانہ رویہ پایا جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں نظم و ضبط شاذ ہی ملتا ہے لیکن مخدوم کی شخصیت اس عام تاثر کی ضد تھی۔ فن کار اور زندگی میں نظم و ضبط یہ دو باتیں ان کی شخصیت میں ایک دوسرے سے متضاد نہیں بلکہ یک جا نظر آتی تھیں۔

مقالے کی تیاری کے دوران اور اس کے بعد بھی کئی بار مخدوم صاحب سے ملاقاتوں کا شرف حاصل رہا۔ تقریباً ہر دفعہ پہلے ہی سے ملاقات کا وقت مقرر ہوتا۔ کبھی گھر پر، کبھی پارٹی آفس پر ملاقات کے لیے جانا پڑتا وہ اکثر ملنے کے لیے علی الصبح وقت دیتے تھے اور شاید ہی ایسا ہوا ہو کہ مقررہ وقت پر وہ موجود نہ رہے ہوں جبکہ میں ان سے ملاقات کا وقت لے کر دو ایک بار مقررہ وقت پر پہنچ نہ سکا۔ رات کتنی ہی دیر تک جاگے ہوں وہ اپنے ہر نئے دن کی مصروفیات کا آغاز صبح کی ابتدائی ساعتوں ہی سے کرتے تھے۔

ایک مرتبہ میں نے ان سے انٹرویو کے دوران میں چند رومانی نظموں کے پس منظر کی وضاحت چاہی۔ ان کی وضاحت پر میں نے چند سوالات پوچھے اور تفصیلی جوابات کی درخواست کی وہ تفصیلات بیان کرتے ہوئے ایک لمحے کے لیے رُک گئے اور پھر اس بارے میں کچھ نہ کہا اور یہ بھی ہدایت کی کہ ان تفصیلات کے بیان سے احتراز کیجیے۔ تنازعہ پیدا کرنا اور تعلقات بگاڑنا مناسب نہیں۔ اسی وقت شاعر مخدوم کا رویہ ایک باشعور اور ذمہ دار شہری کا رویہ تھا۔ انھیں اپنی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس تھا۔ وہ جانتے تھے کہ بے شمار لوگ ان سے کیا توقعات رکھتے ہیں اور انھیں کتنا اونچا مقام دیتے ہیں۔ وہ ان توقعات، جذبات اور احساسات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔

# اسداللہ وجہی

مولوی عبدالحق کے اُردو ادب پر یوں تو بڑے احسانات ہیں لیکن وجہی کو اردو کے علمی وادبی حلقوں میں روشناس کر کے اردو ادب پر مولوی عبدالحق نے جو احسان کیا ہے اسے آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔ مولوی صاحب کا یہ کارنامہ صرف اس وجہ سے ہی قابل قدر نہیں ہے کہ انھوں نے ساڑھے تین سو سال پرانے قطب شاہی دور کے ایک نثر نگار اور شاعر وجہی کو دریافت کیا بلکہ اس وجہ سے بھی ہے کہ انھوں نے ایک ایسے بلند پایہ تخلیقی فن کار اور ترشے ہوئے ہیرے کی دریافت کی جس کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں اور چمک دمک سے معاصرین کی شہرت و دمک ماند پڑ گئی اور جو آج بھی پوری آب و تاب سے چمک رہا ہے اور سب کی آنکھیں خیرہ کیے ہوئے ہے۔

وجہی کا اصلی نام اسداللہ تھا اور تخلص وجہی۔ اس نے چار قطب شاہوں کا دور دیکھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے دور میں دکنی زبان کے نامور شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی اور اسے یہاں تک عروج حاصل ہوا کہ محمد قلی

کے دربار میں اسے ملک الشعراء کا منصب عطا کیا گیا اس نے اپنی مشہور مثنوی قطب مشتری اسی دور میں لکھی۔ محمد قلی کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کے دور میں وجہی نے بُرے دن دیکھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سلطان محمد قطب شاہ وجہی سے ناخوش تھا۔ نہ صرف شاہی دربار سے اس کی وابستگی ختم ہوی بلکہ اس دور میں مالی پریشانیوں کے ساتھ ہی ساتھ سخت تکلیفیں بھی اٹھائیں۔ وجہی نے تقریباً پندرہ سال اسی طرح پریشانیوں میں کاٹے۔ لیکن سلطان محمد قطب شاہ کے بعد جب سلطان عبداللہ قطب شاہ تخت نشین ہوا تو گولکنڈہ کے دربار کا ماحول بدل گیا۔ پھر سے شعر و ادب کو شاہی سرپرستی اور ادیبوں اور شاعروں کو قدر و منزلت حاصل ہوی۔ وجہی جیسا پختہ کار اور بلند پایہ تخلیقی فن کار سلطان عبداللہ قطب شاہ کی توجہ سے کس طرح دور رہ سکتا تھا چنانچہ وجہی کو نہ صرف دربار میں رسائی حاصل ہوی بلکہ وہ لطف و کرم سے بھی نوازا گیا۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کی فرمائش پر ہی وجہی نے "سب رس" جیسی بے مثل کتاب تصنیف کی۔

عبداللہ قطب شاہ کے دور کا شاہی مورخ نظام الدین شیرازی اپنی تصنیف "حدیقۃ السلاطین" میں وجہی کا تذکرہ دکنی شاعر کی حیثیت سے کرتا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں وجہی ایرانی یا تورانی اور عرب یا کسی اور غیر ملکی کی حیثیت سے نہیں بلکہ دکنی کی حیثیت سے مشہور تھا۔

تقریباً دس سال قبل وجہی کا ایک ضخیم فارسی دیوان دریافت ہوا ہے۔ جو سالار جنگ لائبریری کے شعبۂ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ اس مخطوطہ کی دریافت پر جناب اختر حسن کا مضمون "قطب مشتری اور سب رس کے مصنف ملا وجہی کے بارے میں نئی معلومات" بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

وجہی کی زندگی کے حالات کے بارے میں ہمیں کوئی مواد دستیاب نہیں تھا۔ قطب شاہی تاریخیں اور تذکرے وجہی کے بارے میں سوانحی مواد فراہم نہیں کرتے۔ فارسی دیوان کی داخلی شہادتوں سے اُردو دنیا اس عظیم فن کار کے اصلی نام آبائی وطن، قطب شاہی بادشاہوں سے اس کے تعلقات اور اس کی زندگی کے نشیب و فراز سے واقف ہوئی ہے اس اعتبار سے تو فارسی دیوان کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن اس دیوان کے دریافت ہونے اور اس کے مطالعہ سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وجہی فارسی کا بھی بڑا شاعر ہے اور فارسی میں اس کا کلام کسی طرح اس کے معاصر ایرانی شاعروں سے کم نہیں ہے۔

دکنی میں وجہی کی دو تصانیف ہیں قطب مشتری اور سب رس۔ اس کے علاوہ ایک نثری رسالہ "تاج الحقائق" کو بھی وجہی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن اس رسالہ کے مصنف کے بارے میں ناقدین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔

دکنی شاعری میں وجہی کا مقام بہت بلند ہے وہ اساتذۂ فن میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس کے شاعرانہ مرتبہ کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ محمد قلی قطب شاہ جیسے زبردست دکنی شاعر کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ اس کی مثنوی قطب مشتری ایک اہم شعری کارنامہ سمجھی جاتی ہے۔ اس مثنوی میں اس نے محمد قلی قطب شاہ کے معاشقے کو افسانوی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مثنوی کے بیان میں کہیں کہیں چند غزلیں اور رباعیاں بھی آگئی ہیں اور اس کے ابتدا تا آخر وجہی کی قادر الکلامی عیاں ہے۔ دکنی میں وجہی کی شاعرانہ حیثیت مسلمہ ہے لیکن جس نے وجہی کو اُردو ادب میں زندہ جاوید بنا دیا وہ اس کی نثری تصنیف "سب رس" ہے "سب رس" وجہی کا وہ نثری کارنامہ ہے جو بلاشبہ قدیم

اُردو کے نثری ادب کا سرمایہ نازو آبرو ہے اور جس پر اُردو ادب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

قدیم اردو میں سب رس سے قبل جو مربوط نثری کارنامے ملتے ہیں ان سب کا شمار مذہبی نثر میں ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ یا تو بزرگان دین وصوفیائے کرام کی تصنیفات ہیں یا ان کے ملفوظات وارشادات ہیں۔ اس طرح وجہی کی تصنیف سب رس اُردو میں ادبی نثر کا سب سے پہلا نمونہ قرار پاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ سب رس اردو میں تمثیل نگاری کا بھی سب سے پہلا نمونہ ہے۔ محمد یحیٰ بن سیبک فتاحی نیشاپوری کی مثنوی دستور عشاق اور نثری قصے حسن و دل، سب رس کے ماخذ ہیں لیکن وجہی نے تفصیل سے احتراز کرتے ہوئے ماخذ کے کئی حصے حذف کر دیئے ہیں۔ اور اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔ قرآن مجید کی آیات، احادیث اور بزرگان دین کے اقوال کے علاوہ مختلف زبانوں کے اشعار، اقوال، محاورے اور کہاوتیں جگہ جگہ نقل کی ہیں۔

سب رس کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی زبان اور اسلوب بیان ہے۔ عربی اور فارسی میں صنائع وبدائع کی جو قدیم اور عظیم الشان روایت ہے اس سے وجہی نے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔ عبارت کی آرائش اور قافیہ کی پابندی کے باوجود اس کا طرز بیان تکلف وتصنع سے پاک ہے۔ مقفیٰ، مسجع اور رنگین عبارت کے باوجود وجہی کا اسلوب سلیس اور شگفتہ ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وجہی نے ریزہ کاری نہیں کی ہے بلکہ یہ اس کی تخلیقی جبلت میں داخل ہے۔ اپنے اسلوب کے بارے میں وہ لکھتا ہے۔

"جتے چو ساران، جتے فہم داران، جتے گن کاران ہوئے سن آچ، لگن کوئی اس جہان میں ہندوستان میں ہندی زبان سوں اس لطافت اس چھنداں

سوں نظم ہور نثر ملاکر گلاکر نہیں بولیا۔"

وجہی کا یہ دعویٰ بالکل درست ہے کہ وہ اس اسلوب کا موجد ہے۔ وجہی سے پہلے کے نثر نگار صرف اپنا مافی الضمیر بیان کر دینے پر اکتفا کیا کرتے تھے۔ ان کی تحریریں ادبی نثر کے لوازم سے یکسر مفقود ہیں۔

سب رس کے اسلوب میں جو دلکشی اور حسن ہے جو نغمگی و موسیقیت ہے اس کا اندازہ اس کتاب کے بالکل ابتدائی جملوں سے کیا جا سکتا ہے وہ کہتا ہے۔

"تمام مصحف کا معنی الحمدللہ میں ہے مستقیم، ہور تمام الحمدللہ کا معنی بسم اللہ میں ہے۔ قدیم، ہور تمام بسم اللہ کا معنی بسم اللہ کے ایک نقطے میں رکھیا ہے۔ کریم، سمج دیکھ خاطر لیا آنال حدیث بھی یوں آئی ہے کہ العلم نقطۃ وکثرہا جہال یعنی علم یک نقطہ ہے جاہلاں اسے بڑھائے جہالت کوں اس حد لگن لیائے۔ ہور فارسی کے دانشمنداں جنوں سمجھتے ہیں باتاں کے بنداں انوں کو یوں بھایا ہے انوں میں بھی یوں آیا ہے کہ" اگر در خانہ کس است یک حرف بس است" ہور گوا یسر کے جا تراں گُن کے گراں انوں بھی بات کوں کھولے ہیں۔ یوں بولے ہیں۔"

وجہی کے ان فقروں میں عربی فارسی اور ہندوی الفاظ شامل ہیں لیکن ان الفاظ کا امتزاج کوئی لفظی توڑ جوڑ نہیں بلکہ یہ ایک تخلیقی عمل کا قدرتی نتیجہ ہے۔ یہ تخلیقی عمل نہ صرف ان سے لسانی صوتی امتزاج کا حامل ہے بلکہ ان کی ترتیب و تشکیل میں غنائی اصول شامل ہے اور اس میں جو چیز بنیادی طور پر کارفرما ہے وہ ہے آوازوں کا مخفی حسن۔

سب رس کے متذکرہ بالا جملوں سے قطب شاہی عہد میں علم کے

کے بارے میں اس نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے کہ علمی اکتشافات کا رخ تنوع اور کثرت سے وحدت کی جانب تھا جبکہ جدید دور میں تجزیے اور جزوی مہارت کو اہمیت حاصل ہے۔

وجہی کے فارسی دیوان کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اسے فارسی زبان پر پورا عبور حاصل تھا اور وہ خود بھی اپنے آپ کو فارسی شاعری میں اساتذۂ فن کا ہم پلہ سمجھتا تھا۔ لیکن نثر نگاری کے لیے اس نے جس زبان کا انتخاب کیا وہ دکنی تھی۔ دکنی وجہی کی مادری زبان تھی۔ اور وہ جن سے مخاطب تھا ان کی مادری زبان بھی دکنی تھی۔ وہ ان کے مزاج اور ذہنی ساخت سے بھی بخوبی واقف تھا۔ دکنی زبان میں ادبی نثر کی روایت موجود نہ ہونے کے باوجود سب رس جیسی اعلیٰ درجہ کی نثری تصنیف پیش کرنا وجہی کی بلند پایہ تخلیقی صلاحیتوں کی دلیل ہے۔ اس میدان میں بنیاد رکھنے کے باوجود اس نے جو کمال اور مہارت دکھائی ہے اسے اس کا پورا پورا احساس ہے۔

"جکوئی اچایا بنیاد اول آخر دہیا استاد۔ یو عجائب نظم ہور نثر ہے۔ جانو بہشت میں کا قصر ہے۔ سطر سطر پر برستا ہے نور۔ ہر ایک بول ہے یک حور، اسے پڑھ کر جنے خط پایا جانو بہشت میں آیا۔"

سب رس نثر میں وجہی کا نقش اول ہونے کے باوجود کسی پختہ کار اور اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کے حامل نثر نگار کے نقش آخر سے کسی طرح کم نہیں۔

شاید بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ قطب شاہی دربار میں زیادہ تر ایرانی شعراء اور ادیب ہی جمع تھے۔ بادشاہوں سے قربت کی وجہ سے علمی و ادبی حلقوں اور عوام میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ دکنی شعرا بالعموم

درباروں سے دور اور خانقاہوں سے قریب تھے۔ وجہی اس ماحول میں ایک دل چسپ کردار کی مثال پیش کرتا ہے۔ وہ صوفیوں اور خانقاہوں سے بھی وابستہ رہا اور دربار سے بھی۔

وجہی بلاشبہ ایک اعلیٰ درجہ کا آرٹسٹ ہے اور اسے کمالِ فن کا پورا پورا احساس ہے وہ بیرونِ ملک (ایران) کے عالموں، ادیبوں اور شاعروں سے مرعوب نہیں ہے۔ کسی کا حسن، رنگ و روپ لباس فاخرہ اور امارت اس کی نگاہوں میں نہیں جچتے۔ اسے اپنی صلاحیتوں پر بھرپور اعتماد ہے اور ان پر بجا طور پر نازاں ہے۔ وجہی کے ایک فارسی شعر سے اس دور کے ماحول کی اور خود اس کی ایک صاف اور واضح تصویر ذہن میں ابھرتی ہے وہ کہتا ہے۔

ہیچ کس را در نظر ہرگز نمی آرم وجہیہ
مست و جاہل صورتم خوش در تکبر ماندہ ام

اس شعر میں وجہی کا اشارہ دربار کے ایرانی شعراء اور باکمالوں کی طرف ہے یہ شاعر اور باکمال رنگ و نسل شائستگی اور تہذیب اور شان و شوکت کے اعتبار سے بظاہر کتنے ہی بلند سہی لیکن وجہی جس حال میں ہے خوش ہے اور اپنے آپ پر فخر کرتا ہے۔ وہ کسی احساس کمتری کا شکار نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا ظاہری رنگ روپ معیارِ زندگی ہم عصر ایرانی شعراء اور باکمالوں کے مقابلہ میں کمتر تھا وہ ان مہذب معاصرین کے مقابل جاہل یا گنوار نظر آتا تھا لیکن علم و فن کے معاملہ میں وہ ان سے پیچھے نہیں تھا بلکہ اپنی طرز کا منفرد اور اپنے دور کا بے مثال ادبی دیوتا تھا اس کی تصنیف "سب رس" سے اُردو نثر کو جو تازگی، رس، مٹھاس اور نغمگی ملی ہے آج بھی کوئی اس سے منکر نہیں ہو سکتا۔ ○

# الطاف حسین حالی

حالی نے خود اپنے بارے میں کیا خوب بات کہی ہے۔

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اس سے بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکان سب سے الگ

یہ شاعرانہ تعلّی نہیں ہے صاف اور کھلی حقیقت ہے۔ اُس دور میں حالی کے "نایاب مال" سے گاہک بے خبر تھے اور اس کی قدر و قیمت سے پوری طرح واقف نہیں تھے لیکن آج ادب کے بازار میں ان ہی کا مال انمول ہے۔ اس دور کے بہت سے کھرے سکے کھوٹے ثابت ہو چکے ہیں اور حالی کے سکہ کو بہت جلد کھرا مان لیا گیا۔ اور آج تک اسی سکہ کا چلن ہے۔

حالی کے اثرات اردو شعر و ادب پر اتنے گہرے دیرپا اور دور رس ہیں کہ اس کا تجزیہ مختصر گفتگو میں ممکن نہیں۔ انھوں نے اُردو ادب کے چمن میں جو نئے اور صحتمند پودے لگائے تھے وہ آج پھل دار تنا ور درخت بنے کھڑے ہیں۔ حالی وہ واحد شخص ہیں جنھوں نے شاعری اور نثر کی کئی اصناف میں اپنی تخلیقات سے انقلاب پیدا

کیا۔ حالی سے پہلے یا ان کے بعد ہمیں بعض ادبی شخصیتیں نظر آتی ہیں جنھوں نے شاعری اور نثر کی کسی صنف کو نیا موڑ دیا اور اس کے دھارے بدل دیے۔ چنانچہ انھیں اس صنف کی حد تک امام مانا گیا لیکن کسی کو حالی جیسا امتیاز حاصل نہیں جنھیں کئی شعری اور نثری اصناف میں امام اور بانی کی حیثیت حاصل ہے۔

صرف اتنا کہہ دینا ہی کافی نہیں ہے کہ سادگی اور دردمندی حالی کی سیرت کی نمایاں خصوصیات تھیں اور ان کی تخلیقات میں یہ خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں اور حالی کا ادب حالی کی شخصیت اور سیرت کا عکس ہے۔ ہمیں تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ کن باتوں اور کن شخصیتوں نے حالی کو حالی بنایا۔ کس کے کہنے پر انھوں نے شاعری اور ادب کی خدمت کرنے پر توجہ دی۔ کن کن بزرگ اور ہم عصر شخصیتوں نے ان کے ذوقِ شعری کو نکھارا اور کس کی تحریک نے حالی کو اپنی طرف کھینچا۔

سب سے پہلے حالی کو غالب کی صحبت سے فیض اٹھانے کا موقع ملا۔ جس وقت حالی غالب سے ملے اس وقت ان کی عمر ۱۷-۱۸ برس ہوگی۔ حالی میں طبعی میلان اور شاعری کا جوہر دیکھ کر غالب نے خلافِ معمول انھیں فکرِ شعر کی صلاح دی۔ حالی کی نظر اور بصیرت کا کیا کہنا۔ اپنی کم عمری اور غالب کی غیر مقبولیت کے باوجود انھوں نے غالب کی عظمت اور بڑائی کا صحیح اور بھرپور اندازہ کر لیا تھا۔ حالی غالب کی شاعری کے دل سے معترف تھے۔

حالی نے غالب سے زیادہ مصطفیٰ خاں شیفتہ کی صحبت سے فیض پایا۔ شیفتہ کے خیالات اور مذاق نے حالی پر بڑے گہرے اثرات چھوڑے۔

شیفتہ کے انتقال کے بعد حالی کو پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت مل گئی۔ یہاں انگریزی کتابوں کے اردو ترجموں کی اصلاح کا کام ان کے ذمے تھا

یہاں چار برس کے قیام نے ادب کے بارے میں حالی کے خیالات۔ نظریات اور مذاق میں بڑی تبدیلی پیدا کی۔ جب حالی لاہور سے نکلے تو انھیں سرسیّد کی تحریک نے اپنی طرف کھینچا اور انھوں نے اپنی تمام صلاحیتیں اس تحریک کی نذر کر دیں۔

حالی کا نظریہ یہ تھا کہ علم و ادب اور شعر و حکمت کے ذریعوں کو اصلاح معاشرہ اور تہذیب اخلاق کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے یہی نہیں بلکہ استعمال کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ وہ جدید ادب کی تحریک کے علمبرداروں میں شامل ہو گئے۔ کہ اُردو شعر و ادب کے ان سانچوں کو بدلا جائے جو نئے حالات و تصوّرات سے اب کوئی مطابقت نہیں رکھتے جو فرسودہ اور از کار رفتہ ہو چکے ہیں۔ وہ ادیبوں شاعروں اور اردو کی علمی و ادبی سوسائٹی کو اس مصنوعی فضا سے نکالنا چاہتے تھے جہاں نئے افکار کا دم گھٹتا جا رہا تھا۔

حالی کی خوبی صرف یہی نہیں تھی کہ وہ خواب ہی دیکھتے اور منصوبے بناتے تھے بلکہ حقیقی معنی میں عالم باعمل تھے اور اپنے خوابوں کی تعبیر اور اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لیے مسلسل سرگرم عمل رہنا جانتے تھے۔ انھوں نے ادب اور زندگی کے تعلق سے جو نیا سائنٹیفک نظریہ اختیار کیا اُسے انھوں نے اپنے ادب اور زندگی میں ایک مستقل اور باقاعدہ رویہ کی شکل دے دی۔ اگر حالی کی تخلیقی قوتیں اعلیٰ پایہ کی نہ ہوتیں تو ان کی نظم و نثر سپاٹ اور موضوعاتی چیزیں بن کر رہ جاتیں اور اس پر شعوری کوشش کا گمان ہوتا لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ حالی اپنی دیگر خصوصیات کے علاوہ ایک ایسے تخلیق کار بھی ہیں جن کی تخلیقی قوتوں کا سرچشمہ بہت دور تک اور بہت بڑے پیمانے پر علم و ادب کی پیاسی اور سنگلاخ زمین

کو سیراب اور شاداب کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح خود یہ بات بھی اُردو ادب کو حالی کی بہت بڑی دین بن جاتی ہے۔

شاعری کے بارے میں حالی کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں ان کا یہ قطعہ بڑی مدد دیتا ہے۔

اے شعرِ دل فریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جو ہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں
تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تو

حالی کے قیام لاہور کے دوران میں انجمن پنجاب کے زیرِ اہتمام جو شاعرے منعقد ہوتے تھے ان میں مصرعہ طرح کی بجائے شاعروں سے کسی خاص عنوان پر طبع آزمائی کی درخواست کی جاتی تھی۔ حالی اور آزاد نے بھی ان مشاعروں کے لیے نظمیں لکھیں ان کی نظمیں اردو میں ایک نئی چیز تھیں۔

سرسید کی تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد حالی نے سنہ ۱۸۷۹ء میں مسدس حالی یا مد و جزر اسلام لکھی جو حالی کی شاعری کا بہت بڑا کارنامہ ہے جس کی تاثیر اور شاعرانہ دردمندی کی ایسی مثال اردو کی کسی اور نظم میں مشکل سے ملے گی۔ اس نظم کو جو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ایسی شہرت و مقبولیت بھی کسی اور نظم کو نصیب نہ ہوئی۔ یہ نہ صرف اُردو کی پہلی طویل نظم ہے بلکہ یہ پہلی مقصدی اور اصلاحی نظم ہے۔ اس نظم سے اردو شاعری میں واقعیت، افادیت اور اجتماعیت کے

رجحانات آئے۔ اس نظم نے پہلی مرتبہ یہ ثابت کر دیا کہ شاعری سے اصلاح و انقلاب کا کام کس طرح لیا جا سکتا ہے۔ قاری اس نظم کے کسی حصہ کو غیر دلچسپ نہیں پاتا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ساری نظم ایک ہی بحر میں ہونے کے باوجود حالی نے اس میں شروع سے آخر تک شعری آہنگ کو قائم رکھا ہے۔

اس نظم کے بعد حالی نے کئی اور قومی نظمیں لکھیں جن میں مناجات بیوہ اور چپ کی داد قابل ذکر ہیں۔

حالی نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا اور ابتدائی دور کی غزلوں میں روایتی رنگ پوری طرح موجود ہے۔ زبان میں رنگینی اور دلکشی بھی ہے۔ لیکن حالی غزل کے مخالفین میں سے تھے اور قدیم رنگ سخن سے سخت بیزار تھے۔ چنانچہ لاہور سے دہلی آنے کے بعد سنہ ۱۸۷۵ء سے انھوں نے نئے رنگ اور نئے انداز کی غزل گوئی کا آغاز کیا۔ حالی کی جدید غزل اخلاقی اور اصلاحی خیالات کی ترجمان ہے۔

عام طور پر حالی نے غزل میں علامتوں سے انحراف کیا غزل کی علامتیں نئے تجربوں اور تازگی اظہار میں حائل ہو رہی تھیں۔ وہ اظہار کے لیے نئے امکانات کی جستجو میں تھے کیونکہ غزل کی علامتیں سیر بذیر نقطہ پر پہنچ چکی تھیں۔ ہر انفرادی تجربہ مروجہ علامتوں کے استعمال کی وجہ سے پرانا اور فرسودہ معلوم ہوتا تھا۔

ہر دانشور کی طرح وہ بھی چاہتے تھے کہ ان کے تجربوں میں پیرایۂ اظہار کی تازگی ہو اور انداز بیان دوسروں سے مختلف ہو، ایک جیسے یا عام تجربے کو وہ انفرادی اظہار بیان کے ذریعہ شاداب بنانا چاہتے تھے۔ اس لیے انفرادیت کے اظہار کے لیے انھوں نے راست اظہار کا پیرایہ استعمال کیا۔ حالی کی غزل سے روایتی علامتیں پوری طرح غائب نہیں ہیں۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی غزلوں کا بنیادی instruments پرانی علامتیں

نہیں ہیں۔

حالی اُردو میں جدید طرز کی سوانح نگاری کے بانی ہیں۔ حالی نے جن اصولوں کو پیش نظر رکھ کر سوانحی تصانیف مرتب کیں اُردو میں سوانح نگاری اسی راہ پر چل پڑی۔ حیاتِ سعدی، یادگارِ غالب اور سرسید کی سوانح "حیاتِ جاوید" کے بعد اردو میں ان شخصیتوں کی اس سے بہتر سوانح نہیں لکھی گئیں۔ اُردو ادب میں یادگارِ غالب کے مرتبہ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج بھی اگر کوئی غالب کی حیات اور شاعری پر قلم اٹھانا چاہے تو یادگارِ غالب سے رجوع ہوئے بغیر کام نہیں چلتا حالانکہ اس وقت تک غالب پر مضامین اور کتابوں کا انبار لگ چکا ہے۔

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب سوانح نگار کسی ایسی بڑی شخصیت کی سوانح لکھتا ہے جو بقید حیات ہو یا جس سے مصنف کے تعلقات قریبی اور گہرے ہوں تو ایسی صورت میں سوانح نگار ایسے واقعات کے تذکروں کی بھرمار کر دیتا ہے جن میں وہ بھی شریک ہے۔ اس کی کتاب تصویروں کا ایسا البم بن جاتی ہے جس کی ہر تصویر میں مصنف خود موجود رہتا ہے۔ حالی میں انکسار کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہے اور خود نمائی سے تو وہ کوسوں دور ہیں اس لیے وہ اپنی سوانحی تصانیف میں اہم اور ضروری واقعات میں بھی اپنے تذکرہ کو شامل کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔

حالی سے پہلے اُردو میں تنقید کا وجود باقاعدہ فن کے طور پر نہ ہونے کے برابر تھا۔ تذکروں یا دیگر تحریروں میں جو تنقیدی اشارے اور تنقیدی خیالات ملتے ہیں ان سے تنقید کے اصول وضع کرنا ممکن نہیں۔ مقدمہ شعر و شاعری تنقید کے میدان میں پہلی لیکن بہت اہم و قیع کوشش ہے۔ حالی نے اپنے مقدمہ میں شعر کے بنیادی اصولوں اور شاعری کے مقصد پر بحث کی ہے۔ شاعری کے بارے میں عام طور پر جو غیر صحت مند

تصورات پائے جاتے تھے۔ انھیں دُور کرنے شاعری کے افادی پہلو کو واضح کرنے اور شاعری کو حقیقت اور زندگی سے قریب کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے مشرق و مغرب کے خیالات اور نظریات پر کافی غور و فکر کے بعد اس کتاب میں ان سے استفادہ کیا ان کی تنقید سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور آج تک اُردو تنقید میں جو ارتقا ہوا ہے اس کتاب کا مرہونِ منت ہے۔

سرسیّد نے پہلی بار رسالہ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ اردو زبان کو توسیع دینے اور اسے علمی و ادبی زبان بنانے کی شعوری کوشش کی تھی۔ وہ اردو نثر کے ایک ایسے طرز کو مستقل طور پر رواج دینا چاہتے تھے جو رواں، سلیس اور عام فہم ہو اور ساتھ ہی ساتھ علمی و ادبی رنگوں کے لیے موزوں بھی ہو۔ سرسید کے رفقا میں ان کی اس تحریک کو جس شخص نے سب سے زیادہ پروان چڑھایا وہ حالی ہیں۔ حالی نے اس طرزِ تحریر کے ایسے کامیاب نمونے اپنی نثر کے ذریعہ پیش کیے کہ سرسید کے مشن کی تکمیل ہو گئی۔

حالی کے کئی ہم عصر صاحب طرز ادیب تھے لیکن حالی کے طرز اور اسلوب ہی کو مقبولیت اور بقائے دوام حاصل ہوا۔

حالی نے شاعری کے لیے جو زبان استعمال کی ہے وہ بھی کئی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے ان کے یہاں لکھنؤ کی شاعری کی طرح دل کشی، حُسن اور نفاست نہیں ملے گی لیکن یہی کمی ان کی شاعری کا حُسن ہے۔ حالی کی شاعری کو پڑھنے والا خواہ وہ دہلی کا ہو یا لکھنؤ کا۔ پنجاب کا ہو یا حیدرآباد کا بڑی آسانی سے شاعر کی بات سمجھتا اور سر دھنتا ہے۔ حالی کی زبان پر کسی خاص علاقہ کی چھاپ نہیں ہے۔ یہ وہ زبان ہے جو ساری اُردو دنیا میں پڑھی اور سمجھی جاتی ہے۔

اُردو زبان اور ادب کی زلفیں سنوارنے والوں میں بہت سے نام ملتے ہیں لیکن حالی کا چہرہ بار بار سامنے آتا ہے ۔ اُردو زبان اور ادب کی ہمہ گیری کے لیے جس ادبی شخصیت نے سب سے زیادہ حصہ ادا کیا وہ بلاشبہ الطاف حسین حالی ہیں۔

OO

# اسرار الحق مجاز

تاریخ اردو ادب میں یوں تو کئی انوکھی، دل کش اور زنگارنگ شخصیتیں موجود ہیں۔ لیکن مجاز کی شخصیت کچھ اور ہی ہے۔ بڑی دل دکھانے والی بھی اور بڑی دل لبھانے والی بھی۔ آزاد منش و سرکش بھی اور شائستگی جنون کا ایک پیکر بھی۔ انہوں نے زندگی میں بڑے نشیب و فراز دیکھے لیکن اپنے حالات پر انھیں رونا نہ آیا وہ ہر رنگ میں "رقیب سر و ساماں" نکلے۔ اپنی ذات کو مٹا دیا لیکن اپنے مزاج کی شگفتگی اور ظرف کے بانکپن میں فرق نہ آنے دیا۔ وہ ایک شاعر تھے اور انھوں نے ایک ایسے فن کار کی زندگی گذاری جو اپنی زندگی اور ضرورتوں سے بے نیاز رہتا ہے اور ماحول اور سوسائیٹی سے اس بات کی توقع کرتا ہے کہ اسے اس کی تخلیقی صلاحیتوں اور خدمات کے عوض وہ منصب عطا کیا جائے گا جس کا وہ مستحق ہے۔

شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں پر پہنچے پر مجاز پر سرور اور نشہ کا عالم طاری ہوا لیکن عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد انہیں زندگی کے

تلخ حقائق کا اندازہ ہوا۔ یکے بعد دیگرے ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا لیکن محرومیوں اور ناکامیوں کے باوجود تلخی اور نفرت نے کبھی دل میں راہ نہ کی کسی سے بدلہ اور انتقام لینے کی بجائے تمام غموں کو شراب میں گھول دینے کی کوشش کی۔

مجاز کی زندگی اور شخصیت ایک افسانہ ہے اس افسانہ کی تعمیر میں جو عوامل کارفرما تھے وہ متضاد اور ایک دوسرے سے متصادم تھے۔ یہہ افسانہ رومانی اور دل کش ضرور ہے لیکن اس کا انجام بڑا تکلیف دہ اور حسرت ناک ہے۔

مجاز نے ۱۹۱۱ء میں بارہ بنکی کے ایک قصبہ ردولی کے متوسط درجہ کے زمین دار گھرانے میں جنم لیا۔ ان کی بڑی ناز و نعم کے ساتھ پرورش ہوی۔ یوں تو خاندان میں سب ہی کے لاڈلے تھے مگر ماں کی تمام تر توجہ اور محبت کا مرکز بنے رہے۔ وہ اپنی ماں کی سب سے چہیتی اولاد تھے۔ ماں نے ان کی دیکھ بھال اور پرورش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور آخری وقت تک اپنے اس بیٹے کو بے حساب پیار دیا۔

اپنے وطن میں ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے بعد مجاز لکھنؤ آئے اور امین آباد ہائی اسکول سے میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ والد کا تبادلہ آگرہ پر ہو گیا تھا۔ اس لیے مجاز اعلیٰ تعلیم کے لیے آگرہ چلے گئے اور انٹر کی تکمیل تک آگرہ میں قیام کیا۔ مجاز کی ادبی زندگی کا یہیں سے آغاز ہوا۔ یہیں فانی اور میکش اکبرآبادی سے ان کے مراسم بڑھے اور مجاز نے اپنی چند غزلوں پر فانی سے اصلاح بھی لی۔

سنہ ۱۹۳۰ء میں مجاز علی گڑھ آئے۔ علی گڑھ پہنچنے سے کچھ پہلے ہی سے مجاز

کی دل چسپیوں اور مصروفیات میں فرق آنے لگا تھا۔ تعلیم سے دل چسپی کم ہونے لگی تھی۔ شاعری اور دوسری مصروفیات میں سارا وقت صرف ہونے لگا تھا۔ علی گڑھ میں مجاز کا قیام پانچ سال تک رہا یہ دور مجاز کی ادبی زندگی کا بہت ہی تاب ناک دور ہے۔ مجاز کی شخصیت اور شاعری کی تعمیر اور ارتقا، میں اس درس گاہ اور اس کے ماحول نے بڑا گہرا اثر ڈالا۔ انھوں نے ۱۹۳۵ء میں علیگڑھ سے بی اے کیا۔

علی گڑھ کی پانچ سالہ زندگی میں مجاز کو جو مسرتیں ملیں۔ جو سکون میسر آیا آگے پھر کبھی ایسا سکون واطمینان انہیں نصیب نہ ہوسکا۔ "لکھنو کی پانچ راتیں" میں سردار جعفری نے لکھا ہے کہ مجاز علی گڑھ یونی ورسٹی کے مقبول ترین شاعر تھے۔ ہوسٹل میں" طالب علموں کے کمروں پر، پروفیسروں کے گھروں پر، مشاعروں میں ہر جگہ وہ چھائے رہتے۔" مجاز سراپا خلوص تھے۔ ہر ایک سے بڑی محبت سے ملا کرتے۔ برتاؤ پیار کا ہوتا۔ دوستی، شرافت اور اعلیٰ ظرفی کے جو اونچے تصورات انھیں ورثے میں ملے تھے انھیں ابتدائی عمر میں گھر کے ماحول نے جلا بخشی اور علی گڑھ کی زندگی نے نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔ خلوص سادگی، معصومیت، حاضر جوابی، برجستگی اور لب ولہجہ کی شگفتگی نے مجاز کی سیرت کو حسن بخشا اور انہیں سب کا محبوب بنا دیا۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں یم۔ اے کی تعلیم نامکمل چھوڑ کر ملازمت کے سلسلہ میں وہ دہلی گئے جہاں وہ آل انڈیا ریڈیو کے اردو رسالہ "آواز" کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے وہ بڑی امیدوں اور درخشاں مستقبل کی آرزو اور تلاش میں دہلی آئے تھے۔ لیکن ناسازگار حالات کی وجہ سے ایک سال بعد

ہی ملازمت چھوڑ دی۔ جب وہ دہلی سے لکھنؤ واپس ہوئے تو وہ نہ صرف ملازمت کے چلے جانے کی وجہ سے مایوس و متاثر تھے بلکہ عشق میں ناکامی کی وجہ سے دل پر ایک صدمہ کا بوجھ اُٹھائے ہوئے بھی تھے۔

جس وقت مجاز لکھنؤ پہنچے اس وقت ملک میں ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ طور پر آغاز ہو چکا تھا اور اس وقت لکھنؤ اس تحریک کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ ڈاکٹر علیم، احمد علی، احتشام حسین، سبط حسن، جذبی، سردار جعفری اور رشید جہاں وغیرہ اس وقت لکھنؤ میں جمع تھے۔ مجاز کی شاعری ابتدا ہی سے ترقی پسند رجحانات کی حامل تھی۔ اب انھیں نوجوان ترقی پسند ادیبوں کے اس گروہ کے ساتھ مل کر تحریک کے لیے کام کرنے کا موقع ملا۔ ترقی پسند تحریک کے ترجمان پرچم اور نیا ادب کی ادارت میں مجاز، سبط حسن اور سردار جعفری کے ساتھ شامل تھے۔ مجاز اس دور میں اردو کے محبوب ترین شاعر تھے بڑے سے بڑا مشاعرہ ان کے ہاتھ رہتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں جگر کے سوا کسی اور شاعر کو مشاعروں میں اتنی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ مجاز کی ان کامیابیوں میں شاعری کے علاوہ ان کی پرکشش اور دلآویز شخصیت کو بھی دخل رہا ہے۔ لیکن بہار کے یہ دن جلد ہی ختم ہو گئے اور مجاز کی زندگی خزاں کے تکلیف دہ دور میں داخل ہو گئی وہ پہلے ہی سے دل پر چوٹ کھائے ہوئے تھے اب حالات کی ستم ظریفی اور دوستوں کی نامہربانیوں نے دل ہی کو نہیں دماغ کو بھی متاثر کر دیا۔

۱۹۴۰ء میں مجاز پر جنون کا پہلی بار دورہ پڑا ۱۹۴۵ء اور ۱۹۵۲ء میں دوسرا اور تیسرا دورہ پڑا۔

مجاز نے ناکامیوں، محرومیوں اور سخت ذہنی اذیتوں کے بعد شراب میں پناہ ڈھونڈی اور زندگی کے آخری دنوں میں شراب ہی مجاز کا سہارا تھی اور ان کی سب سے بڑی کمزوری۔ شراب کی کثرت نے مجاز کے جسم کو کھوکھلا اور دماغ کو شل کر دیا اور آخر ایک دن اس نے انھیں ہم سے چھین لیا۔ انگریزی ادب کے جواں سال شاعر کیٹس اور شیلے کی طرح ہندوستان میں نغمہ سنج اور چونکا دینے والی لے رکھنے والے اس محبوب شاعر نے صرف ۴۴ برس کی عمر میں ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

اپنی ماں اور بہنوں کے لاڈلے، عوام کے محبوب و مقبول شاعر، ہر حلقہ اور گروہ کے منظورِ نظر کا انجام بڑا حسرت ناک تھا۔ آخری دنوں میں ان کی کثرتِ شراب نوشی، دیگر بے اعتدالیوں اور بے تکی حرکتوں کو دیکھ کر ان کے بزرگ ان کی اصلاح کے لیے دعا کرتے۔ قریبی دوست احباب محبت سے نصیحتیں کرتے، ٹوکتے حتیٰ کہ سخت سست کہنے پر بھی مجبور ہو جاتے۔

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

مجاز کے انتقال کے دوسرے روز تعزیتی جلسے میں عصمت چغتائی نے اپنی تقریر میں کہا۔

"میں نے اکثر مجاز کو اس کی بعض عادتوں پر ڈانٹا اور کبھی غصہ میں کہا "اس سے بہتر ہے کہ مجاز تم مر جاتے"۔ مجاز نے جیسے منھ پر طمانچہ مار دیا اور کہا "لو میں مر گیا' تم اس کو اتنا بڑا کام سمجھتی تھیں"۔

بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے دہے میں اردو کو جو شاعر ملے ان میں مجاز بلاشبہ اہم اور قابلِ قدر شاعر ہیں یوں تو انھوں نے تقریباً پچیس ۲۵

برسی شاعری کی لیکن درحقیقت ان کی شاعری کی عمر بارہ تیرہ سال (۱۹۳۳ء تا ۱۹۴۵ء) ہے جس میں وہ شاعری کی جانب پوری طرح توجہ دے سکے۔ آخری چند سالوں میں وہ بالکل خاموش رہے۔ فکرِ سخن نہ کرنے کے اسباب پوچھنے پر جواب دیتے۔ "شعر کی دیوی مجھ سے روٹھ گئی ہے" مختصر عرصہ میں مجاز کو جو کامیابی نصیب ہوی وہ قابلِ رشک ہے۔ ایسی کامیابی ان کے معاصر شعراء میں کسی کو حاصل نہ ہو سکی۔

ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعروں میں مجاز کو نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہے۔ مجاز کو فیض، مخدوم اور سردار جعفری پر اس اعتبار سے بھی فوقیت حاصل ہے کہ مجاز کی شاعری نے ترقی پسند اقدار کی تشکیل میں حصہ لیا جبکہ ان شاعروں نے ترقی پسند شاعری کے اچھے اور کامیاب نمونے بعد میں پیش کیے۔ اس کے علاوہ ترقی پسند شاعروں میں سب سے پہلے مجاز کا شعری مجموعہ "آہنگ" ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ جبکہ فیض اور مخدوم کے شعری مجموعے بہت بعد کو شائع ہوئے۔

نغمگی، مٹھاس اور رس مجاز کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔ لہجے کا دھیماپن، نرمی اور گھلاوٹ انھیں دوسرے معاصر شعراء میں ایک منفرد مقام بخشتی ہے۔ مجاز کو فن پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ ان کی زبان میں حلاوت اور نزاکت کا احساس ملتا ہے۔ ان کے ہاں جو نادر اور اچھوتی تشبیہات اور استعارے ملتے ہیں ان میں تخلیقی شان نمایاں ہے۔

مجاز نے عام طور پر سیاسی پروپگنڈا اور نعرہ بازی سے پرہیز کیا۔ وقتی اور ہنگامی مسائل پر لکھی گئیں چند نظموں کو چھوڑ کر اُن کی شاعری فکر اور فن کا حسین اور خوب صورت امتزاج ہے۔ مجاز کے فن اور شخصیت میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے

ان کی شاعری اس دور کی سماجی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کی تصویر پیش کرتی ہے۔ سماجی زندگی کے مسائل اور الجھنوں کے ساتھ ہی ساتھ مجاز کی شاعری میں اس دور کی نوجوان نسل کی محرومیوں، درد و کرب اور احساسات کی سچی ترجمانی بھی ملتی ہے۔

فراق گورکھپوری نے مجاز کی شاعری کو ان الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا ہے۔

"دورِ حاضر کی شاعری میں مجاز ایک عجیب و غریب مظہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایک بان کی طرح چھوٹا اور فضا کی بلندیوں میں پھول سی جگمگاتی ہوئی چنگاریاں بکھیر کر چشم زدن میں بجھ گیا۔ لیکن یہ چنگاریاں اس کے مختصر مجموعۂ کلام میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئی ہیں۔ ان کی جگمگاہٹیں زندگی کی راتوں کو روشن کرتی رہیں گی۔"

رات اور ریل، آوارہ، نذر علی گڑھ، عیادت، اعتراف اور فکر مجاز کی اہم اور کامیاب نظمیں ہیں۔ مجاز بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن ان کی چند غزلیں ایسی ہیں جو قاری کو فوراً اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہیں ان اشعار میں زندگی اور عشق کے عام اور سادہ تجربے خوب صورت اور شاعرانہ انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ جن کی تاثیر سے انکار ممکن نہیں۔

غرض مجاز کی شاعری اردو میں ایک قابل قدر اضافہ ہے جو کئی خصوصیات کی وجہ سے دیرپا اور مستقل حیثیت کی حامل ہے۔ مجاز کی جوانمرگی اردو کی جدید شاعری کے لیے ایک سانحہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۲، ۱۳ سال کی مختصر مدت میں مجاز کی جو اٹھان رہی۔ اگر اس کا فطری اور منطقی ارتقا جاری رہتا اور مجاز حوادثِ زمانہ کے اثر سے ذہنی اور فکری طور پر مفلوج ہو کر اتنا جلد موت کے منہ میں نہ پہنچتے تو یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ جدید اور ترقی پسند شاعری کو اس کا بڑا اور نمائندہ شاعر مل جاتا۔ ٥

# مخدوم محی الدین

"سرخ سویرا" اور "گل تر" کے شاعر مخدوم "بساطِ رقص" چھوڑ کر چلے گئے۔ اس سانحہ کو ۲ سال سے زیادہ ہو چکے ہیں لیکن آج بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ بساطِ رقص پر ان کی جگہ خالی ہے۔ اس گل تر کے رنگ و بو کی آج بھی تلاش ہے۔ مگر کہیں نہیں ملتی۔ صرف یادوں کے چمن میں مہکتی ہے۔ مخدوم ایک شاعر اور فن کار ہی نہیں کمیونسٹ و ٹریڈ یونین لیڈر تھے۔ سیاسی رہنما تھے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ ان کی وفات کے بعد ٹریڈ یونین تحریک نے بھی ان کی کمی شدت کے ساتھ محسوس کی ہوگی۔ سیاست نے بھی انھیں بار بار یاد کیا ہوگا۔ زندگی کے دوسرے شعبے بھی انھیں آواز دیتے رہے ہوں گے۔ لیکن جو خلا ــــــ مکمل خلا وہ بہ حیثیت شاعر اور فن کار کے چھوڑ گئے ہیں پُر نہیں ہو سکتا۔ اس بساط پر کوئی دوسرا مہرہ ان کی جگہ نہیں لے سکتا۔ مخدوم کی ہمہ پہلو شخصیت میں سب سے زیادہ نمایاں شاعر اور فن کار کا دل لبھانے والا پہلو تھا۔ اس تخلیقی فن کار نے جو حُسن کار بھی تھا اپنی بے پناہ تخلیقی

قوتوں کے ذریعہ اپنی شخصیت میں بھی ایسے رنگ بکھیرے تھے۔ ایسے خط کھینچے تھے ایسے زاویئے بنائے تھے اور رنگوں کا ایسا خوب صورت امتزاج کیا تھا کہ اس کی شخصیت بھی اس کی شاعری کی طرح دلاویز دکھائی دیتی تھی۔

مخدوم اردو کے ان معدودے چند شاعروں میں سے ایک ہیں جنھیں اپنے وطن میں بے حساب پیار ملا اور غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جس شخص نے اقتدار اور دولت کے بغیر حیدرآباد میں دلوں پر حکمرانی کی ہے۔ وہ مخدوم ہی۔

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

کہنے والے محبوب شاعر مخدوم نے اعلیٰ انسانی اقدار سے پیار اور سچی انسان دوستی کے باعث لاکھوں کو اپنا بنایا۔ مخدوم کے لیے حیدرآباد میں جو بے پناہ محبّت اور عقیدت پائی جاتی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

مخدوم نے اپنی ساری زندگی ناموافق حالات کے خلاف جنگ کرنے اور پیہم جدوجہد کرنے میں گزاری۔ لیکن ان پیچیدہ اور پرُخار راہوں سے گزرنے کے باوجود زندگی بھر اُن کی زندہ دلی، شوخی اور ترنگ میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ نہ صرف انھیں مستقبل پر آخر وقت تک یقین رہا بلکہ دوسروں کا حوصلہ بھی ہمیشہ بڑھاتے رہے۔

حیدرآباد کی سیاسی، ادبی اور تہذیبی زندگی سے مخدوم کا اتنا قریبی اور گہرا تعلق رہا ہے کہ دونوں کا تصور علیحدہ علیحدہ مشکل ہے۔ مخدوم کے انتقال سے حیدرآباد کے ایک دور کا خاتمہ ہوا۔ ہماری ادبی اور تہذیبی زندگی پر انھوں نے بڑے گہرے اور دیرپا نقوش چھوڑے ہیں۔ مخدوم کی شخصیت اور اس کے سحر سے سب ہی مسحور تھے۔ کیا دوست، کیا دشمن۔ ایک بار ان سے ملنے والا دوبارہ ملنے کا آرزومند ہوتا۔ مخدوم

کی شخصیت میں بلا کی لچک تھی جہاں انھوں نے بے شمار موقعوں پر جلوسوں اور مظاہروں کی قیادت کی۔ انھیں قریب سے دیکھنے والوں نے کئی بار بچّوں کے ساتھ کھیلتے بھی دیکھا ہے۔ ہم نے انھیں ادبی اور سیاسی جلسوں میں پرمغز اور جوشیلی تقریریں کرتے اور مشاعروں کو لوٹتے بھی دیکھا ہے۔ مخدوم نے عقل کو دل کا پاسباں بنایا ہے تو کبھی کبھی دل کو تنہا بھی چھوڑا ہے۔ ان کی شخصیت کے مختلف پہلو ہونے کے باوجود ان کی شخصیت کا ہر پہلو ایک علٰحدہ اور منفرد نوعیت کا حامل ہے۔

اس مردِ آزاد نے اپنی ساری زندگی دوسروں کے لیے وقف کر دی تھی۔ تیاگ، ایثار اور قربانی کو زندگی کا شعار بنایا۔ ماحول کی بے حسی اور لوگوں میں ایثار اور قربانی کے جذبہ کا فقدان دیکھ کر کہتے ہیں۔۔۔

کوئی جلتا ہی نہیں کوئی پگھلتا ہی نہیں
موم بن جاؤ پگھل جاؤ کہ کچھ رات کٹے

مخدوم نے آسودہ حالی اور مادی آسائشوں کی بجائے فقر و فاقہ کی زندگی گذاری۔ اُن کی زندگی سخت آزمائشوں سے گذری اور انھوں نے سخت صعوبتیں برداشت کیں لیکن قدم کبھی نہیں ڈگمگائے۔ مسکراتے ہوئے خندہ پیشانی سے ہر مصیبت جھیلی۔ انھوں نے زندگی سے بھرپور انداز میں محبّت کی اور دوسروں کو زندگی سے محبت کرنا سکھایا۔

مخدوم کو ان کی محنت، صلاحیت اور خدمات کے عوض جو معاوضہ ملتا رہا وہ بے حد قلیل اور غیر متناسب تھا۔ ان دنوں ملک اور قوم کی خدمت کو لوگوں نے منفعت بخش پیشہ بنا لیا ہے۔ لوگ خدمت کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور خدمت کا بہانہ بنا کر اپنی اور اپنے افرادِ خاندان کی زندگیاں سنوار لیتے ہیں۔ مخدوم نے

ملک اور قوم کی بے لوث خدمت کی ۔راہ میں سخت مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن انھوں نے رکنے اور مڑ کے پیچھے دیکھنے کی تک زحمت گوارا نہ کی۔ دم آخر تک اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے رہے۔ زندگی کی اعلیٰ اور مثبت اقدار پر انھیں جو ایقان تھا وہ کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ مخدوم ایک علامت تھے نیکی اور اچھائی کی۔ مخدوم کے کردار کا ایک اہم وصف انسان دوستی اور محبت ہے۔ وہ انسانوں کے فرق اور امتیاز کو نہیں مانتے تھے۔ فرد کے لیے اپنے دل میں جذبۂ اخلاص رکھتے تھے اور تعصب اور تنگ نظری کے دشمن تھے وہ ہمیشہ کمزوروں کا سہارا بنے رہے اور کبھی کسی بااثر اور مقتدر شخصیت سے متاثر نہیں ہوئے۔ اخلاقی جرأت، بے باکی ذاتی و شخصی مفاد سے اجتناب اور کردار کی مضبوطی سے مخدوم نے سب کے دلوں میں جگہ پیدا کرلی تھی۔ ان کے خیالات اور نظریات سے اختلاف کرنے والے اور عوامی اور ادبی زندگی میں انہیں اپنا حریف سمجھنے والے بھی شخصی طور پر ان کا احترام کرتے تھے۔

ادبی محفلوں، مشاعروں اور دیگر تہذیبی تقاریب میں لوگوں کی آنکھیں مخدوم کو ڈھونڈا کرتیں۔ ان کی غیر موجودگی سے لوگ بے چین ہو جاتے۔ کچھ دیر بعد مخدوم ہشاش بشاش، ہنستے مسکراتے ادھر آتے دکھائی دیتے تو سب کی نگاہیں ان کی جانب اُٹھ جاتیں اور یہ جانِ محفل، محفل کی رونق بڑھا دیتا۔ جب وہ نغمہ سرا ہوتے تو سب کے چہرے کھل اٹھتے۔ ان کے اشعار کی نغمگی جب ان کے ترنم سے ہم آہنگ ہو جاتی تو ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی۔ سماں بندھ جاتا۔ حیدرآباد میں کئی بار مشاعروں میں بیرونِ ریاست کے ممتاز مہمان شعراء سے زیادہ دلچسپی کے ساتھ مخدوم کو سنا گیا ہے۔ کبھی وہ تحت اللفظ میں اپنا کلام پڑھنا چاہتے تو سامعین انھیں اسکی

اجازت نہ دیتے وہ توہمیشہ ان کا کلام ان کے سحر انگیز ترنم میں سننا پسند کرتے تھے۔ مخدوم اپنا کلام ڈوب کر سنایا کرتے تھے۔ ان کے پڑھنے کا انداز بے حد متاثر کن تھا۔ سننے والوں کی طبیعت سیر ہی نہ ہوتی تھی۔ سامعین کو اکثر پرانا کلام سننا پڑتا مگر ہر بار وہ کئی دفعہ سنی ہوئی نظموں اور غزلوں کو سن کر ایک نیا لطف لیتے۔

مخدوم بلا شبہ ایک بڑے شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں جگہ جگہ فن کارانہ حسن کے بڑے خوب صورت اور اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ابتدائی شعری تخلیقات ہی کے ذریعہ ادبی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا اور بہت سے دیدہ وروں نے اسی وقت اندازہ کرلیا تھا کہ حیدرآباد مستقبل قریب میں اردو شاعری کو ایک اور باکمال شاعر دینے والا ہے۔

مخدوم نے اس صدی کے تیسرے دہے کے بعد شاعری کا آغاز کیا اور ان کا پہلا مجموعہ "سرخ سویرا" تقریباً دس سال کے فکر سخن کا نتیجہ ہے۔ اس شعری مجموعہ میں رومانی اور انقلابی نظموں کے علاوہ ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جن میں رومانی اور انقلابی شاعری کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ پہلے مجموعہ کی اہم نظموں میں جنگ، مشرق، حویلی، انتظار، انقلاب، اندھیرا، زلف اور اسٹالن قابلِ ذکر ہیں۔

سرخ سویرا کی اشاعت کے بعد چونکہ مخدوم عملی سیاست کے میدان میں داخل ہوگئے تھے۔ اس لیے ایک طویل عرصہ تک وہ شاعری کی جانب توجہ نہ دے سکے۔ اس طویل خاموشی کے بعد انھوں نے جو پہلی نظم لکھی وہ آزاد نظم "قید" ہے جو دوسرے مجموعہ گل تر کی پہلی نظم ہے۔ انھوں نے "چارہ گر" جو ان کی ایک اہم نظم ہے ۱۹۵۶ء میں لکھی۔ اس نظم سے مخدوم کی شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس نظم کے بعد انھوں نے بڑی اچھی اور حسین نظمیں لکھی ہیں جن میں چاند تاروں کا بن، رقص، سناٹا لخت جگر، وقت بے درد مسیحا اور وصال شامل ہیں۔ ان کی نظم "چاند تاروں کا بن" آزادی پر لکھی گئیں بہترین نظموں میں اپنی منفرد شان رکھتی ہے۔ اس نظم کا کینوس

Canvas بہت پھیلا ہوا ہے لیکن مخدوم نے اختصار سے کام لیتے ہوئے بڑی مکمل اور جامع نظم لکھی ہے

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن

مخدوم کے دوسرے دور کی شاعری کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اشاریت کا عنصر نمایاں ہے اور بالواسطہ اور شاعرانہ اظہار کو انھوں نے بڑی اہمیت دی ہے۔ احساس جمال، نغمگی اور موسیقیت کا عنصر از ابتدا تا انتہا ان کی شاعری میں موجود ہے۔ یہی خصوصیات مخدوم کو ان کے ہم عصر شعرا میں ممتاز و منفرد مقام عطا کرتی اور اُن کے اشعار کو دوامی حیثیت بخشتی ہیں۔

مخدوم نے تقریباً ۲۵ برس تک نظم لکھنے کے بعد غزل کی صنف کی جانب توجہ کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی چند نہایت دل کش اور عمدہ غزلوں کے ذریعہ اپنے آپ کو ایک کامیاب غزل گو شاعر ثابت کیا۔ غزل کی صنف کے لوازم اور تقاضوں کا انھوں نے پورا پورا لحاظ رکھا اور بے اعتدالیوں سے پرہیز کیا لیکن اس کے باوجود ان کی غزل روایتی غزل سے مختلف ہے، فکر و اسلوب کی تازگی نے ان کی غزل کو شگفتگی، دل نشینی اور دل آویزی بخشی ہے۔ سماجی اور سیاسی مسائل کو راست طور پر بیان کرنے کی بجائے غزل کے مخصوص اشاروں اور کنایوں میں بڑی مہارت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس طرح صرف چند غزلیں کہنے کے باوجود نئی غزل کے سرمایہ میں اضافہ کیا۔

غرض یہ کہ مخدوم نے بہ حیثیت انسان، رہنما اور شاعر اپنی شخصیت کے ایسے گہرے نقوش چھوڑے ہیں کہ انھیں بھلایا نہیں جا سکتا۔ انھیں ہم سے

جدا ہوئے دو سال کی مدت ہوئی ہے لیکن جب کسی محفل میں ان کا تذکرہ ہوتا ہے تو روشن آنکھوں پر، دل آویز تبسم اور ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ ان کی تصویر اور پرچھائیں ابھرتی ہے اور پھر آنکھوں کے سامنے ان کی کئی تصویریں گھوم جاتی ہیں۔ مخدوم کی یاد تازہ پھولوں کی ایک مہک ہے جس سے دماغ معطر ہو جاتا ہے

یہ صحیح ہے کہ ہم ان کی مادی رفاقت سے محروم ہو گئے ہیں لیکن وہ اپنے پیچھے قیمتی اثاثہ چھوڑ گئے ہیں۔ ان کی شخصیت کے گہرے نقوش اور شاعری کا بیشتر حصہ زندہ اور باقی رہنے والی چیزیں ہیں ؎

بزم سے دور وہ گاتا رہا تنہا تنہا
سو گیا ساز پہ سر رکھ کے سحر سے پہلے

□□